چوپال میں
سُنا ہوا قِصّہ
انور قمر

چوپال میں سُنا ہوا قصہ

افسانے

انور قمر

ناشر

Sinafco Caterers Pvt Ltd.

14A۔ مہرآباد، 33۔ ہِل روڈ، بمبئے 400050

بارِ اوّل : جولائی ۱۹۸۴ء

خوشنویس : عبد الکریم انصاری

سرِورق : پردیپ ساٹھے

طباعت : پیراماؤنٹ آفسیٹ پریس، بمبئی

قیمت : پچیس روپے

ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی 110025
بمبئی 400003

مصنف کا پتا : 13A - گُل اپارٹمینٹس
244B ، سینٹ اینڈریوز روڈ
بمبئی 400050

انتساب

بزرگ دوست، نیک مشیر اور دعا گو

بودھ رام سیسودیا صاحب

کے نام

باؤجی مزدور پیشہ آدمی تھے۔ انہوں نے درس تدریس کے مقدس پیشے کو اپنایا تھا۔ چوں کہ اپنے پیشے کا وہ بہت احترام کرتے تھے۔ اس لئے درسی فرائض کی ادائیگی میں وہ بڑے کشٹ اٹھاتے تھے۔ اپنا سارا جیون انہوں نے انتہائی سادگی سے بِتایا۔ جینے کے لئے اَن کھایا، اَن کھانے کیلئے نہیں جیے۔ سردی گرمی سے بچنے کی خاطر پہنا اوڑھا، کسی رغبت یا شوق سے نہیں۔ آڑے وقتوں کے لئے بچایا، سرمایہ دارانہ ذہنیت کے تحت نہیں۔

انہیں کتابوں سے عشق تھا۔ وہ گھنٹوں مطالعے میں کھوئے رہا کرتے تھے۔ ویدی فلسفے سے متعلق اُن کا مطالعہ خاصہ وسیع تھا۔ موضوعِ گفتگو بھی عموماً مذہب ہوا کرتا تھا۔ لیکن جس طرح وہ ہر تعصب سے پاک تھے اُسی طرح اُن کی گفتگو بھی ہر قسم کی منافرت سے پاک رہا کرتی تھی۔ وہ آواگون پر یقین رکھتے تھے، اور اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنے اچھے کرموں سے اپنی آتما کو رفعت و شان عطا کر سکتا ہے۔

انہیں کوئی طلب اپنی مختصر ضروریاتِ زندگی کے علاوہ کبھی نہ رہی۔ البتہ اپنے آخری ایام میں، اُن کی بس یہی تمنّا رہی کہ اُن کی بصارت کا ضعف کسی صورت بحال ہو جائے، لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ اس کے باوجود، اپنی رخصتی سے چند روز قبل، انہیں وہ جوت نظر آنے لگی تھی جو پران چھوٹنے پر منش کی آتما کو اپنے کنڈل میں لے لیتی ہے۔ دمِ آخر، ممکن ہے ان کے لبوں پر بھگوان کرشن کے یہ شبد رہے ہوں:

"سمبھاونی یُگے یُگے" (میں جنم لوں گا، جُگ جُگ میں)

اب کہ وہ نہیں ہیں، اُن کے وجود کی برکات و فیوض کا نقش اور گہرا ہو گیا ہے۔ اپنا یہ تخلیقی سرمایہ میں اُن کی لازوال یادوں کی نذر کرتا ہوں۔

——— انور قمر

ترتیب

کابلی والا کی واپسی

کابلی والے کے ہونٹ لرزے

"اچھا صاحب، اب مَیں چلوں... وقت کم ہے۔ کچھ سامان بھی خریدنا ہے۔ صبح چار بجے کی گاڑی ہے۔"

"ہاں خان۔"

جیسے میں نیند سے جاگا۔ کوئی دردناک خواب دیکھتے دیکھتے چونکا۔

"اب کب آؤ گے خان؟"

میں نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

ایک انجانے دُکھ سے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے ایک لمبا گرم سانس چھوڑ کر کہا:

"پتہ نہیں صاحب ـــ اکیس برس کے بعد گھر لوٹ رہا ہوں.... پلٹ کر دیکھو تو یہ عرصہ کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا!... آگے دیکھو تو ایک ناقابلِ عبور پہاڑی راستہ!!... اب تو شاید ہی واپسی ہو۔"

یہ کہتے کہتے اُس کا گلا رُندھ گیا۔ اور وہ اپنے وجود کی گہرائیوں میں آئے ہوئے زلزلے سے لرزنے لگا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جیسے اُسے اچانک یاد آیا۔

"صاحب! جاتے جاتے مجھے وہ تصویریں پھر دکھا دیجئے۔ جو تصویریں آپ جیل میں مجھے دکھانے کے لئے اکثر لایا کرتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد گھر جا رہا ہوں چاہتا ہوں کہ وطن کی ہر چھوٹی بڑی یاد تازہ ہو جائے اور اپنے ملک سے برسوں کی دوری کی بنا پر جو اجنبیت کا پُرخوف احساس پیدا ہو گیا ہے میرے دل میں.... وہ ڈر بھی دور ہو۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور بُک شیلف سے کتاب نکال کر اُس کے آگے رکھ دی۔

بیس سال بہت ہوتے ہیں اور قیمتی بھی بہت ہوتے ہیں۔ اپنی بیتی ہوئی زندگی سے ہم اُن کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خان کی زندگی جیل کی دیواروں کے بیچ میں کٹی تھی۔ میں جب بھی اس سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا، یہ کتاب، اُس کی دل جوئی کے لئے، اپنے ساتھ ضرور لے جاتا تھا۔ وہ کتاب کے اوراق اُلٹتا اور اپنی یادوں کے تہہ خانوں میں اتر جایا کرتا۔ پھر وہ آج کے رحمت سے کل کے نوعمر رحمت کو یوں ملاتا گویا وہ جدا جدا شخصیتیں ہوں اور ایک دوسرے سے اجنبی ہوں۔

"یہ ہے میرا مدرسہ۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی صاحب ہمیں عربی پڑھایا کرتے تھے۔"

"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" میں دہراتا،

"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسولُ اللہ" ـــــــ پھر عبدالرزاق دُہراتا،
"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" ـــــــ عبدالقادر دہراتا۔

ہماری آواز مسجد سے لگی خانقاہ کے دریچوں سے نکلتی اور کوہ دمام اور ہندو کُش کی وادیوں میں ڈوب جاتی تھی۔ مولوی صاحب کی آواز بات دار تھی۔ اُن کے چہرے کو دیکھ کر مجھے جلال آباد کا وہ خِطّہ یاد آجاتا کہ جہاں کی زمین سوکھ کر تڑک چکی تھی۔ اُن کی آنکھیں دو بڑے بڑے گڑھوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لمبی سفید داڑھی، باریک مونچھیں، سر پر عمامہ، لمبا کُرتا، کسا ہوا کمر بند، ٹخنوں سے اونچی شلوار اور زری کا کمانی دار جوتا۔ وہ خانقاہ میں بلا معاوضہ قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ پر روزی کمانے کے لئے روس کی سرحد پر لگنے والے بازار میں سے گھوڑے خریدتے اور اُنہیں شہر میں لاکر بیچا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ تجارت یوں کرو کہ جیسے ہمارے رسول نے کی تھی۔ یعنی نفع اُتنا ہی کماؤ کہ جتنا آٹے میں نمک پڑتا ہے۔ صاحب میں بھی اپنا مال بہت کم نفع پر بیچتا ہوں۔ مولوی صاحب کی بات مجھے اب تک یاد ہے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی کہ یہ بات نوعمر رحمت سے نہیں کہی گئی ہے، بلکہ یہ بات کابلی والے نے مجھ سے کہی ہے۔

"وہ دن تو ہمارے لئے بڑی تفریح کا ہوتا کہ جس دن مولوی صاحب اپنے گھر میں اُون رنگا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے مکان کے پچھواڑے پتھروں کو جوڑ کر ایک حوض سا بنا لیا تھا۔ اُس حوض میں وہ اخروٹ کی کوٹی ہوئی چھال اور رنگ پانی میں حل کرتے، پھر وہ اُسے نیچے سے لکڑی لگا کر تپاتے تھے۔ جب یہ آمیزہ

اُبل اُبل کر خوب گاڑھا ہو جاتا تو وہ اُس میں اُون چھوڑا کرتے تھے۔ کیا رنگ چڑھتا تھا اُون پر!"

وہ کہتا:

"دیکھ رہے ہیں آپ اس رومی دروازے کو! پتھروں کی سلیں ایک دوسرے پر رکھی ہوئی یوں نظر آ رہی ہیں کہ جیسے ان کے بیچ کوئی مصالحہ ہی نہ لگایا گیا ہو! آپ چاہیں تو ایک ایک کر کے انھیں اٹھا کر الگ رکھ سکتے ہیں.... لیکن نہیں.... یہ سلیں پچھلے ڈیڑھ ہزار برس سے یوں ہی رکھی ہوئی ہیں۔ نہ تو برفانی ہواؤں کا اثر ہوتا ہے اُن پر، نہ صحرا کے گرم جھکڑوں کا! یہ دیکھئے نا... یہ کمان سترہ سلوں کو جوڑ جوڑ کر بنائی گئی ہے اور ہر دو سلوں کے درمیان میں کھانچے ہیں، لیکن مجال نہیں کہ ایک بھی سِل اپنی جگہ سے سرک جائے۔"

وہ یہ بھی کہتا:

"دیکھئے یہ اُسی خانقاہ کا دروازہ ہے۔ فریم کے اطراف کا پلستر جھڑ چکا ہے، لیکن پھر بھی فریم اپنی جگہ پر قائم ہے۔ لکڑی کے کام میں باریکی نہیں، نقش نہیں، کوئی اُبھار نہیں۔ لیکن.. پائیداری ہے، سادگی ہے اسی لئے دیکھنے میں بھلا لگتا ہے۔ دور دور سے عورتیں اپنی منتیں مانگنے یہاں آتی ہیں۔ اِس کے دستے سے بندھے ہوئے ہر ڈورے سے ایک ایک مراد منسوب ہے۔"

اُس کتاب میں بے شمار تصویریں تھیں۔ کابلی والا ورق اُلٹے چلا جاتا اور اُس کا کلام بھی جاری رہتا۔

"یہ ہے عبدالرحمان سقّہ۔ چاندی کے پیالوں میں دھوپ میں جھلستے ہوئے

مسافروں کو پانی پلایا کرتا... گرمیوں میں پہاڑیاں تپ جاتیں تو وہاں سے ہوا بگولوں کی شکل میں ہمارے شہر میں داخل ہوا کرتی تھی۔ گھر سے نکلنا جان جوکھوں کا کام ہوتا۔ ایسی تپش میں عبدالرحمان کی آواز 'پانی لے لو پانی۔ پیر مراکش کے چشمے کا ٹھنڈا پانی'،
اُس کا پانی واقعی کلیجے کو ٹھنڈک پہنچاتا اور جسم کو تراوٹ بخشتا تھا۔"

کابلی والے کی اُن تمام باتوں کو میں کیوں کر سمیٹوں، بیس سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے واقعات۔ بعض اوقات رحمت ایک ہی تصویر کے کئی کئی ورژن پیش کرتا۔ مجھے لگتا کہ مقام تو ایک ہی ہو سکتا ہے۔ عمارت بھی ایک ہی ہوگی، راستہ بھی ایک ہی ہوگا۔ لیکن موسم بدل جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ دل کی کیفیتیں بھی! دن رات میں اور رات دن کے قالب میں اتر جاتی ہے۔ اِن بدلتی ہوئی رتوں اور اس لمحہ لمحہ پگھلتے ہوئے وقت کے درمیان میں کتنے رنگ، کتنی خوشبوئیں، کتنے نغمے ہم دیکھتے، محسوس کرتے اور سُنا کرتے ہیں۔ یہ تمام احساس ہمارے ذہن کے تہہ خانوں میں اُتر کر روپوش ہو جاتے ہیں لیکن جب کبھی ہم اس کیفیت سے ملتی جلتی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ تمام رنگ، وہ تمام خوشبوئیں اور وہ تمام نغمے دھیرے دھیرے ہمارے ذہن کے گھونسلوں سے خوش رنگ پرندوں کی طرح برآمد ہونے لگتے ہیں! اور پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

کابلی والا کبھی مجھ سے پہاڑوں پر بسے ہوئے گاؤں کا ذکر کرتا۔ پہاڑوں ہی پر قائم مدرسوں میں تختیاں لکھتے اور خدا کی حمد و ثنا کرتے بچوں کا ذکر کرتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کوہ بابا، بند بیابان، سفید کوہ، کوہ دمام، ہندوکش اور کوہ سلیمان پر چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں آباد ہیں کہ جن پر اِس جدید دَور کا سایہ تک نہیں پڑا اور وہاں کے باسی اب بھی قدیم روایتوں اور پارینہ رسموں کے سہارے اپنی زندگی گزارا کرتے ہیں۔

وہ کسی دوست محمد خاں، ہمایوں، احمد شاہ، عاشق خان، شاہ محمود، فتح خان کامران، شیر علی اور یعقوب خان کا ذکر کرتا کہ جو بلند و بالا پہاڑیوں پر جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جایا کرتے تھے، یا پہاڑوں پر سے نمک حاصل کرتے اور پھر گاؤں میں آکر اُسے تبرک کے طور پر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اُنہی سے منسوب کابلی والا مجھے وہ واقعے بھی سناتا کہ کس طرح احمد شاہ نے ایک حملہ آور شیر کو اپنے لٹھ کی واحد ضرب سے ادھ مُوا کر دیا تھا اور کسی موقعے پر شیر علی نے ایک کوڑیالے ناگ کو اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

کاشتکاری کی صعوبتیں، مُردوں کو راتوں میں دفنانے کے پُراسرار واقعات، کارواں کے گزرنے کا سحر انگیز بیان وہ یوں کرتا گویا ہر منظر اس کی آنکھوں میں تصویر بن چکا ہو۔ وہ وہاں کے بازاروں، دستکاروں اور عاشقوں کا بھی ذکر کرتا۔

مجھے تو روزنامچہ لکھنا چاہیئے تھا۔ تب کہیں جاکر میں اس قابل ہوتا کہ اس یادداشت کے سہارے آپ کو وہ تمام واقعات تفصیل سے سناتا۔ اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ وہ باتیں میرے ذہن سے محو ہو چکی ہوں۔ پتہ نہیں کب کوئی لمحہ کسی واقعے کو از سرِ نو یاد کرا دے اور میں رحمت ہی کی تڑپ اور لگن سے اُن باتوں کو آپ کے گوش گزار کر سکوں۔

"خان، یہ کتاب تم اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے،" آں ؟ .... نہیں صاحب۔ اِسے لے جاکر کیا کروں گا؟ اب تو میں خود ہی وہاں پہنچنے والا ہوں۔ اُسی فضا میں سانس لوں گا۔ اپنے لوگوں میں رہوں گا۔ انہیں پہاڑوں میں گھوموں گا۔ وہی نغمے سنوں گا۔ نہیں، مجھے اس کتاب کی ضرورت نہیں۔ ویسے صاحب! میرے لئے یہ

"اُتنی ہی مقدس ہے کہ جتنا مقدس ہے میرے لئے قرآن اور یہ میرے لئے اتنی ہی متبرک ہے جتنی متبرک ہے میرے لئے سیرت النبی۔ اسے آپ اپنے پاس احتیاط سے رکھیں نہ جانے کب یہ کسی کے کام آجائے۔"

رحمت نے اُسے آنکھوں سے لگایا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے احترام سے اس نے وہ کتاب میرے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں رکھ دی۔ اُسی لمحے میرے دل میں خیال آیا کہ اب میں اس کی نئی جلد بنواؤں گا اور اسے جزدان میں لپیٹ کر اپنے بُک شیلف میں رکھوں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ کتاب رحمت کے ان خوابوں کا مسکن ہے کہ جن کی تکمیل کی خاطر آج وہ اپنے وطن جا رہا ہے۔

ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ اُس نے آنکھیں پونچھیں اور پھر مکان کی دہلیز سے باہر نکل آیا۔ مَیں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کچھ فاصلے تک اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر رک گیا۔

آخر جدائی کے لمحوں کو مَیں کب تک ٹال سکتا تھا۔

خان نے مڑ کر ہاتھ ہلایا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ تعلقات کے ریشمی بندھنوں سے اپنے آپ کو رہائی دلانے میں اُسے دشواری ہو رہی تھی۔

آخری بار جب میں نے اُسے خوب غور سے دیکھا تو مجھے اچانک محسوس ہوا کہ عمر اس کی پیٹھ پر اپنا بھاری بوجھ ڈال چکی ہے!

میرے سینے میں درد کا لاوا اُبل پڑا۔ بیس برس پہلے یہ لمبا تڑنگا پٹھان میری بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے جب میرے گھر میں داخل ہوا تھا تو مجھے اُسے دیکھ کر وحشت سی ہوئی تھی اور مجھے اپنی بچی کا وجود خطرے میں نظر آیا تھا۔

لیکن آج ۔ ۔ ۔ ۔ !

وہ موسمی پرندے کی طرح رخصت ہو رہا تھا اپنے دیس کو ۔ کہ جہاں فرحت بھی تھی اور چاہت بھی ، دلنوازی بھی تھی اور راحت بھی اور جہاں کا موسم خوشگوار تھا ۔

کابل کے بازار میں جب رحمت کی بس جا کر رکی تو کوئی شور نہیں اٹھا کوئی کسی کو لینے نہیں لپکا ! کسی نے کسی کو نہیں پکارا ! نہ قہوہ بیچنے والے کی آواز آئی ! نہ کسی چائے والے کی پکار سنائی دی ! کوئی آواز تھی تو صرف ،

سڑکوں پر دھمکتے بوٹوں کی ۔ ۔ !!

کابلی والا بس کی کھڑکی سے سر ٹکائے سو رہا تھا ۔

' لے ' ، کسی نے اُسے ٹھوکا دیا ۔

رحمت کراہ کر اٹھا ۔ ایک فوجی رائفل کے دستے سے اسے دوبارہ ٹھوکا دینے جا رہا تھا ۔ رحمت نے دونوں ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا ۔

" پاسپورٹ " ، فوجی نے تحکمانہ لہجہ میں کہا ۔

کابلی والے نے اپنے جھولے میں سے پاسپورٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیا ۔

" ہندوستان سے آئے ہو ؟ " سوال پشتو میں کیا گیا ۔

" ہاں ۔ "

فوجی کے رویّے نے اُسے دکھی کر دیا تھا ۔ یہ کیا ۔ میرے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک !

" میرے ساتھ آؤ " یہ کہہ کر فوجی بس میں سے تیزی سے اتر پڑا ۔

" میرا سامان " ۔ رحمت نے بس کے کیریئر پر رکھے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا ۔

اُس فوجی نے اپنے ساتھی سے کسی غیر زبان میں بات کی۔ دوسرے نے اثبات میں گردن ہلائی۔

کابلی والا اب تک سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

"ارے بھائی" مجھے اپنا سامان تو لینے دو۔ تم اپنی ہی ہانکے جا رہے ہو۔ میں کوئی چور اُچکا نہیں ہوں اور نہ ہی اسمگلر ہوں"

"بکواس بند کرو ۔ جو کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔

یہ کہہ کر اُس فوجی نے رائفل کے دستے سے اس کے شانوں پر دوسرا ٹھوکا دیا۔

آہ ۔ خان اپنا شانہ تھام کر کراہا۔ اُس کے جی میں آیا کہ رائفل چھینے اور گھما کر ایسا ہاتھ مارے اُس کے ماتھے پر کہ کھوپڑی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے۔

لیکن اُس کے کانوں میں بوٹوں کی دھمک کے ساتھ ساتھ اجنبی زبان میں دیئے جا رہے فوجی احکامات بھی گونج رہے تھے۔

اب وہ فوجی کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا اور مینٹل نوٹس لینے لگا تھا۔ سڑک اب پختہ ہو چکی ہے۔ لیمپ پوسٹ قایم کر دیئے گئے ہیں۔ فلمی پوسٹر، اشتہارات ... اُس نے گالی دی۔ دنیا میں سب سے زیادہ چڑھ اگر اُسے تھی تو اِن اشتہارات سے تھی۔ جھوٹے، گمراہ کن اشتہارات، جو اپنے مال کا وصف بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اُس میں وہ وہ خوبیاں بیان کرتے ہیں کہ جن کا سرے سے اُس میں وجود ہی نہیں ہوتا۔ سالا کوئی تو ہو کہ جو اپنے مال کا تھوڑا سا کھوٹ بھی بتا دے۔

پولس اسٹیشن ... ہاں وہی ہے۔ عمارت کو لیپ پوت کر، نئی روح

پھونک دی گئی ہے اُس میں! پتھر کی بنی ہوئی عمارت لمبی چوڑی! لیکن یہ کیا؟ بیس پچیس برس پہلے یہ اتنی وسیع تو نہ تھی۔ اور اب!

کیا میرے دیش میں اتنے جرم ہونے لگے ہیں؟

وہ کئی راہ داریوں سے ہوتے ہوئے کئی کمروں کے سامنے سے گزرتے، عمارت کے بالکل آخری حصے میں پہنچ گئے جہاں صرف ایک کمرہ تھا اور دو باوردی فوجی پہرے پر تعینات تھے۔

خان کو اُن کی تحویل میں دے کر یہ فوجی دستک دے کر اُس کمرے کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس ہوا۔ اشارے سے اُس نے خان کو اندر آنے کو کہا

سب سے پہلی بات جو خان نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ کمرہ بہت بڑا تھا۔ اس کا فرنیچر اعلیٰ اور قیمتی تھا۔ دوسری بات جو اُس نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ کھڑکیوں پر دبیز پردے پھیلے ہوئے تھے۔ باہر والے کو اندر کی کسی بات کا نہ تو علم ہو سکتا تھا، نہ احساس۔ تیسری بات جو اس نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ جو شخص ٹیبل کے پیچھے اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا وہ اُس کے ملک کا باشندہ نہیں تھا۔

"بیٹھو"۔ اُس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ذرا سی جھجک محسوس کرتے ہوئے خان کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا، یہ شخص مجھ سے کیا پوچھے گا؟ اُن سوالات کے پیچھے اس کا کیا مقصد ہوگا؟ آخر یہ شخص کون ہے؟ غیر ملکی ہے تو پشتو کیسے جانتا ہے؟ یہ سوچ کر اُسے اُلجھن سی ہونے لگی۔

رحمت اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر ایسی ہی الجھنوں کا شکار ہوا

تھا۔ یہ اُلجھنیں ہی تھیں کہ جو اُسے ٹینس (Tense) رکھتی تھیں اور اُس کے اعصاب پر بوجھ ڈالتی تھیں۔

"کتنے عرصے بعد لوٹے ہو؟" اُس نے رحمت کے پاسپورٹ کو اُلٹتے پلٹتے ہوئے پوچھا۔

"اکیس برس بعد" خان اگلے سوال کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

"اکیس برس بعد، اتنے برسوں تک کیا کرتے رہے؟" سوال میں ہمدردی کا پہلو نمایاں تھا۔

"سوکھا میوا..." خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سوکھا میوا بیچنے کی غرض سے وہ یہاں سے ہندوستان گیا تھا۔ پھر جو حادثہ پیش آیا، جس کے نتیجے میں اسے عمر قید کی سزا ملی۔ کیا میں اس کا ذکر کردوں، تو پھر یہ میرا شمار خونیوں اور قاتلوں میں کرنے لگے؟

"ہاں ہاں کہو... رُک کیوں گئے؟" اُس کے لہجے سے شفقت اب بھی ٹپک رہی تھی۔

خان نے ہمّت باندھی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سارا واقعہ سنا دیا۔ میوے کی فروخت... پھر خریدار کا میوے کی خریداری سے مُکر جانا... بعد ہجّت کے طیش میں آکر خان کا اُسے چھرا مار دینا...

"اور پھر مجھے بیس سال کی سزا ہو گئی"۔ یہ کہتے کہتے خان کی آواز بلند ہو گئی ـــ

"اوہ ـــ"

"اچھا یہ بتاؤ تم نے اس دوران میں اپنے گھر کوئی خط لکھا؟"

"خط "

" ہاں " اُس نے ہامی بھری ۔

" کئی لکھے ۔ اپنی بیوی کو ، اپنے بھائی کو ، اپنی بیٹی کو " وہ یاد کرنے لگا ۔۔

" اور اپنے دوست رمضان خان کو "

" لیکن ہمارے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ انہیں تمہارا کوئی خط نہیں ملا ۔

" نہیں ملا ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے ۔"

" اُن کی جانب سے تمہیں کوئی خط مِلا ؟"

" نہیں " خان پریشان ہوگیا ۔

" اور سُنو ، تمہارا دوست رمضان اب یہاں پر نہیں ہے ۔ وہ کراچی جا چکا ہے ، تقریباً سات برس ہوئے ۔ وہاں وہ ٹیکسی چلاتا ہے "

" ٹیکسی چلاتا ہے ؟ کراچی میں ہے ؟ " خان کو جیسے اس کی بات کا یقین نہیں آیا ۔

اُس کے ذہنی اُفق پر رمضان کی بڑی دُھندلی تصویر اُبھر آئی ۔ رمضان اب یہاں نہیں ہے ۔ کراچی میں ٹیکسی چلاتا ہے ۔ اُس سنگین شہر میں ، جہاں لوگ چھرا لے کر سینوں پر چڑھ بیٹھتے ہیں اور بات بات میں ماں بہنوں کو یاد کرتے ہیں ۔ اور وقت بے وقت علاقائی تعصب ، رنگ و نسل کا فرق اور فرقوں کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے کا ذکر کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ رمضان وہاں کیسے جی پاتا ہوگا ؟

" لیکن صاحب آپ کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں ۔ اور میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ غیر ملکی ہیں ؟"

وہ مُسکرایا۔ اور ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل خان کے سامنے اُچھال دی۔

"یہ تمہاری تاریخ ہے۔"

"میری تاریخ؟"

"ہاں تمہاری ہسٹری۔ اس میں سب کچھ درج ہے۔۔۔۔۔ تمہارے چچا محمد یار خاں مظفر آباد کے موضع گڑھی سیّداں سے شہر کابل میں کب وارد ہوئے؟

اُن کی سرپرستی میں تمہارا بیاہ دلاور خاں کی بیٹی زینب سے کب ہوا؟

دوسری جنگِ عظیم کے دوران تمہارے چچا کا موروثی کاروبار کیوں کر ٹھپ ہوا؟

اور پھر تم اپنی قسمت آزمانے ہندوستان کب گئے؟

یہاں تمہارے کون کون سے رشتے دار ہیں اور کن کن کا انتقال ہو چکا ہے؟"

'انتقال؟ خان نے ہاتھ بڑھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

'انتقال؟ کس کا انتقال ہوا ہے؟ بتائیے۔۔۔ میری بیوی، میری بیٹی، میرا بھائی خیریت سے تو ہیں نا؟

"ہاں۔۔ سب خیریت سے ہیں۔ جب تم اپنے گھر جاؤ گے تو تمہیں سب پتہ چل جائے گا۔"

کچھ دیر بعد وہ بولا:

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں یہاں کس کام سے بھیجا گیا ہے؟"

"کام سے؟"

"ہاں۔۔۔۔ لیاقت علی خاں نے۔"

"نہیں جناب میں کسی کام سے نہیں آیا ہوں یہاں، اور لیاقت علی خاں

سے میرے مراسم بڑے پرانے ہیں۔ ہم دونوں نے اکھٹے ہی کابل چھوڑا تھا۔ اب وہ دلّی میں کسی جگہ ملازم ہے۔ وہ مجھ سے کیا کام لے گا۔ میں تو اپنی بیوی، اپنی بچّی اور اپنے بھائیوں سے ملنے آیا ہوں۔ اُن کے ساتھ اپنی زندگی کے بچے کھچے دن گزارنے آیا ہوں۔ آپ کو.... آپ کو شاید میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے جناب! میں بہت معمولی آدمی ہوں۔"

رحمت نے اپنے تئیں یہ باتیں تو بڑی زندہ دلی اور بڑے خوش گوار انداز میں کہیں۔ لیکن دلی طور پر وہ رنجیدہ ہو چکا تھا۔ اُسے فکر ہونے لگی تھی کہ کسی انجانی غلطی کی سزا نہ مل جائے اُسے۔ بہ ظاہر متین اور سنجیدہ نظر آنے والے اُس چوڑے چکلے شخص سے اب وہ خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم کبھی اُس کے دفتر بھی گئے ہو؟"

خان کے لئے اس کے سوالات ناقابلِ برداشت ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بخار میں تپ رہا ہے اور کوئی لاؤڈ اسپیکر اُس کے کانوں سے لگائے چیخ رہا ہے۔

"بس جناب بس کیجئے۔ کل کے لئے بھی کچھ اُٹھا رکھئے اور اِس وقت مجھے اپنے گھر جانے دیجئے۔ آپ کیوں مجھ پر شک کر رہے ہیں؟

میں وہی رحمت ہوں کہ جس کی زندگی کا ایک طویل حصہ اس سرزمین پر گزرا ہے۔ یہ میرا وطن اور میری اُمنگوں کا گہوارہ ہے۔"

یہ کہہ کر رحمت کرسی سے اٹھا۔ کرسی اُلٹ گئی۔ رحمت پر اب اتنی ہیبت طاری ہو چکی تھی کہ اسے خیال بھی نہ آیا کہ وہ الٹی ہوئی کرسی کو سیدھا کر دے۔ وہ لڑکھڑاتے

ہوئے قدموں سے کمرے سے باہر چلا آیا۔

آفیسر نے ٹیبل کے داہنے کونے پر نصب بٹن دبایا۔

دو باوردی فوجی کمرے میں داخل ہوئے۔

"اُس پر نظر رکھو اور کل ۱۰ بجے یہاں پھر پہونچنے کی ہدایت دے دو۔"

وہ اپنی ایڑیاں بجاکر مجسموں کی طرح پلٹے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

اُن کے جاتے ہی کمرہ ایک ویران مقبرہ میں بدل گیا۔

رحمت کو اپنا مکان تلاش کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اِس بیس برس کے عرصے میں سب کچھ بدل چکا تھا۔ ماحول بھی اور منظر بھی۔ درخت اکھاڑ دیئے گئے تھے اور اُن کی جگہ ٹیلی فون، ٹیلی گراف اور لیمپوں کے پوسٹ کھڑے کر دیے گئے تھے۔ کچے پکے مکان ڈھا دیے گئے تھے اور ان کی جگہ سیمنٹ کنکریٹ کے مکعب تعمیر کر دیے گئے تھے۔ دور دور تک کوئی حصہ کھلا نظر نہ آتا تھا۔ شانے سے شانہ لگائے مکانوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔

دو چار جگہوں پر پوچھتا پچھارتا آخر کار رحمت اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اپنوں سے ملنے کی بے چینی کے سبب اُسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ بیس بائیس برس پہلے کے تمام واقعات اُس کی نظروں میں گھومنے لگے۔ اُسے وہ خط یاد آیا جو ہندوستان پہنچتے ہی اُسے اپنے بھائی کی جانب سے ملا تھا۔

برادرِ عزیز!

اللہ تعالیٰ کے کرم سے تمہارے ہاں چاند سی لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

بھابی خیریت سے ہیں اور تمہارے سلسلے میں بے حد فکر مند رہتی ہیں تم
نے اپنے ہونے والے لڑکے یا لڑکی کے جو دو چار نام ہمیں بتائے تھے ہم
نے انہی میں سے ایک نام تمہاری بیٹی کا منتخب کیا ہے۔ 'ارجمند بانو'
اپنا احوال بہ تفصیل ہمیں لکھ بھیجنا..............

....

اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے رحمت نے دروازے سے لٹکتی ہوئی زنجیر
کھٹکھٹا دی۔

"کون ؟"

کوئی زنانی آواز اندر سے آئی۔

"میں ہوں"

رحمت سوچنے لگا یہ میری بیٹی کی آواز تو نہیں ؟ اپنے گھر میں کوئی اجنبی آواز
کیسے گونجے ؟ اب وہ جوان ہو چکی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کی آواز کو میں کیوں کر پہچانوں ؟
لیکن رحمت کے کان میں جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا' یہ تیری بیٹی کی آواز ہے۔
ارجمند بانو کی آواز"

"میں... میں کون ؟"

رحمت کو محسوس ہوا کہ اب آواز دروازے کے بہت قریب سے آئی ہے۔

بے اختیارانہ طور پر رحمت کے منہ سے نکلا۔

"میں ہوں میری بیٹی میں ہوں.. تیرا باپ رحمت"

گویا آسمان شق ہو گیا۔ رحمت کو ایک مسرت آمیز پکار سنائی دی "اب.. با"...

والہانہ طور پر وہ اُس کے سینے سے چمٹ گئی۔

"ابّا۔ کتنی دیر کردی تم نے آنے میں!... کتنی دیر کردی تم نے آنے میں!!

رحمت اُس کے سر پر ہاتھ پھیرے جاتا تھا اور آنسو اس کی داڑھی میں جذب ہوتے چلے جاتے تھے۔

یکے بعد دیگرے اُس کی ملاقات اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے ہوئی۔ بیس برس کے عرصے میں وہ اپنے بے شمار عزیزوں کو کھو چکا تھا۔ کوئی ہمیشہ کے لئے اِس جہان سے کوچ کر گیا تھا تو کسی نے تلاشِ معاش میں اپنا وطن چھوڑ دیا تھا۔ کوئی لام پر تھا! تو کوئی قید میں!!

مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھایا گیا۔ برادری کے کم وبیش پچاس ساٹھ آدمی جمع تھے۔ وہ تمام اُس کی خیریت دریافت کرتے رہے اور اُس کے وطن واپس ہونے پر اپنی مسرت، ظاہر کرتے رہے۔ روٹیاں اُس کی بیٹی، بھابی اور پاس پڑوس کی عورتوں نے سینکیں۔ آب گوشت، زینب نے پکایا، مرغے شیر خان نے بھونے۔

اُن کی باتوں سے رحمت نے اندازہ لگایا کہ اب ایسی دعوتیں عنقا ہو چکی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ راشن پر اناج اور مٹّی کا تیل ملتا ہے شکر کی بڑی قلّت ہے۔ دبے سُروں میں اُسے یہ بھی بتا دیا گیا کہ سیاسی فضا ناساز گار ہے رات میں دروازے پر دستک دی جاتی ہے۔ پھر وہ شخص غائب ہو جاتا ہے یا اطلاع ملتی ہے کہ فلاں فلاں جگہ پر وہ قید کر دیا گیا ہے۔

آدھی رات کے قریب اُس نے زینب کو چھُوا۔

'کہیئے' اُس نے دھیرے سے کہا۔

"تمہیں مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں"، رحمت نے اُس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں۔

زینب کے سامنے گویا اکیس برس کی تمام صعوبتیں اپنے بیمار اور مدقوق چہرے سے ظاہر ہوئیں۔ اُس نے ایک ایک کو گِنا، ہر ایک کو پہچانا۔ لیکن رحمت کے ہاتھوں کو اپنے سینے پر تھام کر انہیں فراموش کر دیا۔

"کیسی شکایت؟ اگر ہو بھی تو آپ سے! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ اُن دونوں کو محسوس ہوتا رہا کہ اب وہ نہیں بلکہ اُن کی روحیں ایک دوسرے سے مخاطب ہیں اور اُن کے جسم ایک دوسرے کو اپنی خوشبوؤں، اپنے لمس، اپنے انداز اور اپنی تپش سے پہچان رہے ہیں۔

فجر کی نماز کے لئے جب رحمت کو جگایا گیا تو اس نے دیکھا کہ ارجمند بانو نے اُس کے لئے پانی گرم کر رکھا ہے۔ نیا جوڑا کھونٹی پر لٹک رہا ہے۔ کھڑاویں غسل خانے کے باہر رکھی ہوئی ہیں اور انگیٹھی پر رکھی کیتلی میں سے قہوہ کی خوشبو منتشر ہو رہی ہے۔

ناشتے کے بعد رحمت نے حُقّے کا کش لیا۔ ایک نظر زینب پر ڈالی جو قہوہ کا فنجان ہاتھ میں تھامے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ پھر اپنی بیٹی کو اس نے دیکھا۔ وہ چٹائی کی تیلیوں میں اپنے ناخن پھنسائے کچھ سوچ رہی تھی۔ رحمت کو یاد آیا کہ اس نے کلکتہ کے میوزیم میں نور جہاں کی تصویر دیکھی تھی اور اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تصویر فریم سے نکل کر اس چہار دیواری میں چلی آئی ہے۔

وہ اپنے آپ کو دنیا کا بڑا خوش قسمت آدمی سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیسے اس کا طول طویل سفر مکمل ہو گیا ہے۔ وہ کٹھن راستوں، پہاڑیوں، دریاؤں اور

وادیوں کو عبور کرتا اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اُس نے پھر حُقّہ کا کش لیا، خستہ اور اعلیٰ تمباکو کا خوشبودار دھواں سارے میں پھیل گیا۔"

رحمت کی پلکیں سرور سے بوجھل ہوئیں اور پھر جُھک گئیں۔

اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

ارجمبند نے پوچھا "کون؟"

باہر سے آواز آئی:

"پولس"

اُونگھتا ہوا رحمت ہڑبڑا کر یوں ہوش میں آیا گویا ہزاروں بھینسوں نے اس کے گھر پر حملہ کر دیا ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ اُس متین اور سنجیدہ افسر کے سامنے اُسی کرسی پر بڑا مودّب بیٹھا تھا۔

"کیسے ہو خان؟"

"اچھا ہوں جناب" خان نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ جوڑا تم پر بہت بچ رہا ہے، ہندوستان سے لائے ہو؟"

"نہیں جناب، وہ اپنی مخمل کی واسکوٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا:

"میری بٹیا نے سیا ہے۔"

"اچھا... "اُسے تمہارا سائز کیسے معلوم ہوا۔ یہ جوڑا تو ٹھیک تمہارے ہی ناپ کا ہے۔"

"جناب، وہ اپنی ماں سے میرا قد اور میرا کاٹھ پوچھتی، پھر میرا تصوّر کرتی اور اپنے دھیان سے کپڑے سیتی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے" افسر نے خوش گوار انداز میں پوچھا۔

"ممکن ہے جناب۔ جب لگن سچی ہو اور کام میں کوئی غرض پوشیدہ نہ ہو تو غیب سے امداد نصیب ہو جاتی ہے۔"

"یہاں کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"پروگرام؟"

"ہاں۔ یعنی کہ تم یہاں کیا کرو گے؟"

"کیا کر سکتا ہوں میں یہاں جناب، سوائے یادِ الٰہی کے۔ اس جسم میں صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ساری قوت عمر نچوڑ چکی ہے۔"

"اچھا خان اب یہ بتا دو کہ لیاقت علی خان نے تمہیں یہاں کس کام سے بھیجا ہے؟"

"جناب، میں آپ کو کل ہی بتا چکا ہوں کہ میرا اور لیاقت کا محض دوستانہ رشتہ ہے، ہم وطنی کا تعلق ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے اس کے علاوہ نہ کبھی کوئی غرض رکھی تھی نہ رکھی ہے۔"

"خان تم ہم سے کچھ چھپا رہے ہو۔ خوب سوچ لو۔ نتائج تمہارے حق میں بُرے ثابت ہوں گے۔ میں چاہوں تو تمہیں اس کمرے سے باہر نکلنے نہ دوں۔ لیکن تم اپنے وطن کل ہی لوٹے ہو اس لئے مجھے تمہیں یہاں روکتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

رحمت اس رات اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے کانوں میں افسر کے الفاظ گونجتے رہے اور اس کی آنکھوں کی سرد چاندنی سے وہ جھلستا رہا۔ یہ افسر میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ اِسے مجھ پر کیوں اعتبار نہیں؟ اِسے مجھ پر کیوں شبہ ہے؟ کیا میں اُس سے کچھ چھپا رہا ہوں؟ نہیں کچھ بھی نہیں۔ کیا میں نے اس کی شان میں کوئی گستاخی کی ہے؟

نہیں بلکہ وہ تو اُسے صاحب اور جناب ہی کہہ کر مخاطب کرتا رہا۔ اُسے یاد آیا کہ جو کرسی ہڑبڑاہٹ میں اس سے اُلٹ گئی تھی، وہ اسے کھڑی کیے بنا ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ رحمت کو اب یہ واقعی گستاخانہ حرکت معلوم ہوئی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے اُس نے اُس افسر سے اجازت بھی نہیں لی تھی اور نہ اُسے رخصتی سلام کیا۔ خدا کرے کہ اب وہ مجھے طلب نہ کرے۔ اس کے باوجود سرِ راہ اگر میری اُس سے ملاقات ہو گئی تو میں ضرور اپنی اس غلطی کی اس سے معافی مانگ لوں گا۔

تسلی دیتے ہوئے وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ غیر ملکی لوگ ہیں۔ آج آئے ہیں کل چلے جائیں گے۔ انہیں ہم سے کیا لینا دینا۔ انگریزوں کی طرح تھوڑے ہی جم کر رہیں گے۔ اور پھر خود حفاظتی کی تدبیریں تو ہر کسی کو کرنی پڑتی ہیں۔ مجھ سے باز پرس ممکن ہے اسی کی ایک کڑی ہو۔ لیکن اگلی سوچ نے ان تسکین بخش خیالات کی بساط اُلٹ دی۔ اُسے یاد آیا، اُس روز کہا جا رہا تھا۔

"سیاسی فضا ناسازگار ہے۔ . . . رات میں کسی کا بھی دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ یا تو وہ نابود ہو جاتا ہے یا خبر ملتی ہے کہ فلاں فلاں جیل میں قید کر دیا گیا ہے۔

نادانستہ طور پر اُس کے منہ سے آہ نکل گئی۔

"کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" زینب نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"اوں . . ہاں کھڑکی بند کر دو مجھے ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے۔"

"کھڑکی تو بند ہے۔ ٹھہریے میں آپ کو ایک اور لحاف اُڑھاتی ہوں۔"

زینب نے دوسرا لحاف اُسے اُڑھا دیا۔

پھر بڑبڑائی:

"یہ موئی بدروحیں بھی تنگ کرتی ہیں اچھے بھلے انسان کو۔ آپ چاروں قُل پڑھ کے سینے پر دم کر کے سویا کریں۔"

وہ خود سورۂ الحمد کا وِرد کرنے لگی۔

فجر کی نماز اُس نے خانقاہ سے لگی مسجد میں ادا کی۔ نماز بعد وہ خانقاہ میں داخل ہوا۔ فاتحہ دی۔ دعا مانگی۔ مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ چند لڑکے خانقاہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اس اجنبی کو حیرت سے دیکھا۔ رحمت نے انہیں سلام کیا۔ بچّوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا، پھر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

خوف اُس کے ذہن سے رفع ہو چکا تھا۔ اُسے یہاں پہنچ کر بڑا سکون مِلا تھا۔ وہ اپنے بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ جب وہ خانقاہ سے نکلا تو سورج پہاڑوں کے عقب سے اُبھر آیا تھا۔ آسمان پر سُرخی آمیز سنہری سیال بکھرا ہوا تھا۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ جب وہ پہاڑوں کی سمت آگے بڑھا تو اس کے قدم تختی پر لکھی تحریر نے جکڑ دیئے۔ فارسی رسم الخط میں جلی حرفوں میں لکھا تھا "لشکر" اور خفی حرفوں میں اِس ممنوعہ علاقہ میں داخلے پر پابندی کے احکامات درج تھے۔

اپنے بھائی کے گھر ناشتہ کرتے ہوئے اُسے معلوم ہوا کہ کثیر تعداد میں غیر ملکی فوجی وہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ پکّی بارکیں بنائی گئی ہیں اور کسی صورت میں اُن کے فوری انخلا کے امکانات نظر نہیں آتے۔ "برادر، تمہاری واپسی ناخوشگوار موقع پر ہوئی ہے۔ اللہ بڑا ہے، یہ غضب بھی ٹل جائے گا۔"

رحمت بڑی دیر سے اِس کشمکش میں تھا کہ وہ اپنے بھائی سے اُس بازپرس کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ کرے تو بھائی اُس کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ اُس کا کوئی واقف کار اگر کسی بڑے سرکاری عہدے پر ہوگا تو ممکن ہے کہ وہ اِس غیر ملکی افسر کو رحمت کے نیک سیرت ہونے کی ضمانت دے پائے۔

لیکن رحمت نے بھائی کو زحمت دینے سے اپنے آپ کو باز رکھا۔ بغل گیر ہو کر جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اُس نے دو باوردی سپاہیوں کو اپنا منتظر پایا۔

دو گھنٹے کے جاں سوز انتظار کے بعد اُس افسر کے کمرے میں اس کی طلبی ہوئی۔ پولس اسٹیشن کے مہیب آسا ماحول اور عمارت کی سنگینی نے اسے اندر ہی اندر سُکیڑ سمیٹ دیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی رحمت نے اُس افسر کو بڑے احترام سے سلام کیا۔ اُس وقت تک کرسی پر نہیں بیٹھا جب تک کہ اُس افسر نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ نہ کیا۔

"حضور اجازت دیں تو ایک بات عرض کروں۔" رحمت نے ہاتھ میں دل رکھتے ہوئے کہا۔

افسر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"جناب عالی، نادانستگی میں مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی ہے۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں . . . ."

"یہی کہ تم آج چھاؤنی کی طرف گئے تھے۔"

نہیں جناب، یہ بات نہیں۔ میں تو ٹہلتا ہوا ادھر کو نکل گیا تھا۔ مَیں تو کچھ اور کہنے جا رہا تھا . . . ."

"لیاقت علی خان کا سند لیسہ تم نے اپنے بھائی کو پہنچا دیا۔"

"نہیں جناب، لیاقت نے مجھے کوئی سند لیسہ اپنے بھائی کے لئے نہیں دیا تھا میں تو حضور . . . ."

رحمت کے گلے میں گرہ پڑنے لگی۔ اُس نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اُس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا یہ کیا میں تو اپنی ایک معمولی سی غلطی کی معافی طلب کرنے لگا تھا، اس نے دو الزام سیاسی نوعیت کے مجھ پر اور تھوپ دئے۔ اُسے کیوں کر معلوم ہوا کہ میں آج چھاؤنی کی طرف جانکلا تھا، اور اپنے بھائی سے ملاقات کا علم بھی یہ رکھتا ہے! کیا اس نے اپنے آدمی سائے کی طرح میرے پیچھے لگا رکھے ہیں؟ اور تو کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا اس کے پاس۔ یہ عزرائیل کی طرح میرے تعاقب میں ہے۔ اِس کے ذہن سے میں یہ شبہات کیسے دور کر سکتا ہوں، حق گوئی ہی میرے کام آسکتی ہے۔

"حضور، معاف کیجئے گا، ذرا ذہن بھٹک گیا تھا آپ کی باتوں سے۔ دراصل میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اُس روز نادانستہ طور پر یہ کرسی الٹ گئی تھی . . . سچّی بات تو یہ ہے صاحب کہ میں بوکھلا گیا تھا اور اسی بوکھلاہٹ میں مجھ سے یہ نادانی بھی ہوئی کہ میں نے نہ اُسے سیدھا کیا اور نہ آپ سے رخصت مانگی، بلکہ بے امتیازی سے چلا گیا۔ صاحب میں نے اِس قصور پر بہت غور کیا۔ اپنے آپ کو لعنت ملامت کیا۔ میں واقعی آپ کی دِل آزاری کا قصوروار ہوں۔ گستاخ ہوں، بے ادب ہوں، آپ مجھے معاف فرمائیں۔ مجھے بخش دیں۔" یہ کہتے کہتے رحمت نے ہاتھ جوڑ لئے اور غیر ارادی طور پر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

افسر کرسی پر جھول رہا تھا۔ اُس کی پُشت کا بوجھ کرسی پر تھا اور کرسی پچھلی دو

ٹانگوں پر کھڑی تھی۔ اپنے کولہوں کے لیور (lever) پر یہ اپنا بوجھ آگے پیچھے کیے چلا جا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اُس نے ٹیبل میں نصب بٹن دبایا۔ وہی باوردی جوان کمرے میں فوجی سلام کرتا داخل ہوا۔ اس نے غیر زبان میں کہا:

"ایک دو روز میں یہ ٹوٹ جائے گا۔ فکر کی بات نہیں اب اِسے گھر جانے دو۔"

پھر اُس نے رحمت کو پشتو میں مخاطب کیا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔"

رحمت کوتوالی سے جب گھر کی طرف چلا تو اُسے احساس ہوا کہ اپنے وطن واپس ہونے کے بجائے وہ کسی اجنبی جگہ پہنچا ہوا ہے۔ یہ اُس کا وطن کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کونے کونے پر کھڑے باوردی سپاہی! یہ گلی کوچوں میں ٹہلتی جیپیں! یہ سڑکوں پر گشت کرتے فوجی ٹرک! یہ راشن کی قطاریں! یہ خوفزدہ چہرے! یہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے لوگ! یہ قدم قدم پر پہرے! یہ زہرناک فضا کیا اُس کے اپنے شہر کی ہے؟ نہیں یہ تو کوئی دیارِ غیر ہے۔ یہ میرا وطن نہیں ہو سکتا۔ اچانک اُس کی نظر ایک بہت بڑے اشتہار پر پڑی۔ اس نے اُسے غور سے دیکھا، سنہری بالیاں، درانتی، ہتھوڑا، سُرخی۔ پل بھر کے لئے اُسے اپنی شبیہہ اُن سنہری بالیوں کی جگہ یوں نظر آئی کہ درانتی کا ہالہ اس کی گردن پر تھا اور ہتھوڑا سر پر۔ یوں اِن دونوں کی ضربوں سے وہ لہولہان ہو گیا سُرخی سارے میں پھیل گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے بستر کے گرد زینب، ارجمند، بلقیس شاہ بانو، داؤد، الیاس اور حسینہ کو کھڑا پایا۔ اُن کے چہروں سے فکر مترشح تھی اور آنکھوں سے غم!

وہ دونوں کہنیوں کے سہارے بمشکل اُٹھا۔ ارجمند نے اُس کی پشت سے تکیے لگا دیے اور وہ اُن کے سہارے بیٹھ گیا۔ اُس نے سبھوں کے چہروں کو پڑھا، پھر مسکرایا۔

"تم سب یوں فکر مند نظر آ رہے ہو کہ جیسے میرا وقتِ آخر آ پہنچا۔ ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے میں۔۔۔۔۔ میں راستے میں بیٹھ گیا تھا۔"

پھر اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "نہیں میں تو گر پڑا تھا۔"

پھر وہ کچھ دیر کے بعد بولا: "رات میں ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی، ممکن ہے دن میں آ گئی ہو۔۔۔۔"

"اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ مجھے تھوڑا سا قہوہ مل جائے تو۔۔۔"

اُس نے ارجمند کی طرف دیکھا، پھر زینب سے مخاطب ہوا۔

"تم ذرا حقّہ بھر دینا۔"

آدھی رات جب گزر چکی تو اُس نے زینب کو جگایا۔ دھیرے دھیرے سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ اُسے تاکید کی کہ ارجمند کی شادی کسی محنت کش نوجوان سے کرنا پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی سے۔ دولت مند سے ہرگز مت کرنا۔ بھائی سے محبّت نہ کرنا۔ کیونکہ وہی سرپرست اور خبر گیری کرنے والا ہے۔ پاس پڑوس والوں سے اپنوں کی شکایت نہ کرنا، کہ یہی کانا پھوسی کرتے ہیں اور پھٹے میں پاؤں ڈالتے ہیں۔ میری فکر قطعی نہ کرنا، میں جہاں بھی رہوں گا، خیر خیریت سے رہوں گا۔ اپنے حالات سے مطلع کرتا رہوں گا۔ اور جوں ہی یہاں سے بلاٹلی حاضر ہو جاؤں گا۔ اللہ بڑا کریم ہے، اُس کی ہر بات میں مصلحت پوشیدہ ہے۔ تم نے زندگی بھر صبر کیا، میری جدائی کے کڑے کوس کاٹتی رہیں،

اب پھر ویسا ہی مرحلہ درپیش ہے۔"

زینب اپنی ہچکیاں روک رہی تھی اور اُس کے آنسوؤں سے رحمت کا گریبان تر تھا۔

صبح کی سیر کے بعد جب میں گھر لوٹا تو اپنے دروازے پر میں نے ایک شخص کو کمبل اُوڑھے اُکڑوں بیٹھا پایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے۔ جو سویرے سویرے آپہنچا ہے۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ دھول میں اٹا ہوا، بوسیدہ لباس میں ملبوس، تھکن اور نیند سے نڈھال رحمت۔

"ار.... رے رے..... تم کب آئے؟"

مَیں نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"گھر گئے بھی یا نہیں؟ بال بچّے تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں صاحب سب ٹھیک ہیں۔ بٹیا جوان ہو چکی ہے۔ بیوی ذرا بوڑھی ہو گئی ہے۔ بھائی کے گھر دو بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔ اُس کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ اور......

میں نے نیچے latch میں کنجی ڈال کر دروازہ کھولا۔ ملازم کو جگا کر اُسے چائے اور ناشتہ تیار کرنے کی ہدایت دی۔ غسل خانے میں جا کر خان کے غسل کا خود انتظام کیا۔ اور پھر جا کر میں نے بیٹی کے کمرے میں جھانکا۔

وہ اپنی بیٹی کو سینے سے چمٹائے سو رہی تھی۔

خان نے نہا دھو کر میرے ساتھ ناشتہ کیا۔

پھر اپنا احوال سنانے لگا۔

"اور صاحب آخری پہر میں اپنی بیوی کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنے وطن سے بھاگ نکلا۔ پہاڑوں اور گھاٹیوں کو پھلانگتا، درہ خیبر سے گزرتا، سرحدی چوکیوں پر فوجیوں اور افسروں کی منت سماجت کرتا، اُن کے ہاتھ پاؤں پڑتا، یہاں پہنچا ہوں۔"

مَیں بھرے دل سے اُسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس سے کیا کہوں؟ کیسے کہوں؟ کیوں کر کہوں؟

مَیں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ تھاما اور بولا:

"دیکھو رحمت تمہاری رخصتی کے بعد سے میں دُکھی دُکھی سا ہو گیا تھا۔ کیوں...؟ مجھے معلوم نہیں۔ اب تم آئے ہو تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہے۔ پتہ نہیں تمہارا میرا کیا سمبندھ ہے؟ تم کون اور میں کون! ممکن ہے بھگوان نے تمہیں میری سنگت کے لئے بھیجا ہو! اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے جیون کے آخری دن ساتھ ساتھ گزارنا ہی ہمارا مقدر ہو! گھر تمہارا ہے، تم یہیں رہو۔ مَیں اکیلے جیتے جیتے اُکتا گیا ہوں۔"

"پتا جی یہ صبح صبح آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟"

یہ کہتے کہتے مینی اپنی بچی کو گود میں اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"رحمت یہ کل ہی اپنی سسرال سے آئی ہے۔"

"ارے کابلی والا... تم؟"

مینی کی باچھیں کھل گئیں۔ اور کابلی والے نے بڑھ کر اُسے گود میں اُٹھا لیا...

کابلی والا مجھ سے پہلے اخبار دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اب وہ مجھ سے سیاسی

مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کرتا ہے اور روزانہ پوچھتا ہے،

"صاحب میرے اخبار میں تو خبر نہیں چھپی، ممکن ہے آپ کے اخبار میں چھپی ہو۔"

مَیں انجانے میں پوچھ بیٹھتا:

"کون سی خبر خان؟"

کابلی والا گمبھیر لہجہ میں کہتا:

"اپنے دیس کی . . . وہاں کے موسم کی۔"

مَیں کہتا:

"نہیں رحمت، اخبار میں وہاں کی کوئی خبر نہیں! ممکن ہے کہ وہاں کا موسم اب بھی ناخوش گوار ہو۔"

کئی دن سے رحمت وہ مصوّر کتاب اپنے ساتھ رکھنے لگا ہے۔ گویا وہ کوئی عیسائی راہب ہو اور یہ اُس کی بائیبل! ایک طبعی کمزوری سی پیدا ہو گئی ہے اُس میں! وہ بیٹھے بیٹھے سو جاتا ہے۔ نیند میں اس کی انگلیاں کتاب سے کھیلا کرتی ہیں، جیسے وہ کوئی ساز ہو، جس کے تاروں کو چھُو کر اُسے سُر یاد آجاتے ہوں۔ کبھی کبھار اس کے سوئے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل جاتی ہے، گویا اُسے کوئی دل آویز نغمہ یاد آگیا ہو۔

مَیں سوچتا ہوں کہ زندگی باوجود اپنی پیچیدگیوں اور اُلجھاووں کے سختیوں اور ناکامیوں کے کس قدر پُر فریب اور پُرکار ہے! بامراد اور بامعنی ہے!

وِسلنگ اسکول بوائے

وِسلنگ اسکول بوائے نے سیٹی بجائی۔ "فی فی فی فو" اور میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ باہر دھندلا سا اُجالا تھا۔ درخت ہلکے ہلکے جھوم رہے تھے۔ میں بستر چھوڑ کر اٹھا۔ منھ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ پھر مَیں نے اپنے بیمار بیٹے پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ سوکھا ہوا تھا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بیوی اس کے سرہانے کوئی ناآسودہ خواب دیکھتی سو رہی تھی، اس کے لب یوں کھُلے تھے گویا اُن سے ابھی ابھی آہ نکلی ہو۔ لڑکی گڑیا کو سینے سے لگائے نیند کے مزے لے رہی تھی۔

جب مَیں اپنے مکان سے باہر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ باہر ٹھنڈ ہے۔ میں نے سگریٹ سلگائی تو مجھے وہ ٹھنڈ گوارا ہوئی۔ اپنے مکان کے کمپاؤنڈ سے نکل کر میں سڑک پر آگیا۔ سڑک داہنی طرف سے شہر کو جاتی تھی، اور بائیں طرف سے وادی کو۔ میں وادی کی اور چل دیا۔

بازار سے گزرا تو میں نے دیکھا چند دُکانیں کھل چکی ہیں۔ لوگ سودا سلف لینے اور کھانے پینے میں لگے ہوئے ہیں، بچّے اسکول جا رہے ہیں۔ اکا دکا موٹر گاڑیاں

بھی گزر جاتی ہیں۔ آگے سڑک دو شاخہ ہو چکی تھی۔ داہنی سمت وہ وادی کو جاتی تھی اور بائیں سمت سینی ٹوریم کو۔ میں سینی ٹوریم کی جانب چل پڑا۔

راستے میں ایک بیکری پڑتی تھی۔ بیکری میں سے پکی ہوئی ڈبل روٹیوں کی مہک آ رہی تھی۔ بیکری کے دروازے پر ایک کتا بیٹھا اپنا جسم چاٹ رہا تھا۔ میں آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت پرانا گرجا ہے جس کا مینار آسمان سے جا لگا ہے۔ گرجا میں خطبہ ہو رہا تھا،

اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک درندہ سمندر کی جانب سے چلا آ رہا
ہے۔ اس کے سات سر تھے اور ان سروں پر دس سینگ، ہر سینگ
پر ایک ایک تاج رکھا تھا۔ اور ہر تاج پر ایک ایک نام تھا جو
خدا کی تذلیل کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

یہ سنتے سنتے میں آگے بڑھ گیا۔ گرجا میں سے آتی آواز مدھم سے مدھم ہوتی گئی۔

"سنو اگر تمہارے کان ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

میرے سر پر ایک درخت کا سایہ تھا اور اس پر بیٹھا دسلنگ اسکول بوائے سیٹی بجا رہا تھا۔

"ٹی، ٹی، ٹی، ٹو۔"

میں آگے بڑھا، وہ راستہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا نظر آیا۔ داہنی طرف سینی ٹوریم تھا اور بائیں طرف ایک اسکول، میں اسکول کی جانب چل پڑا۔ کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر میں ایک کلاس کی کھڑکی سے ٹک کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ بچیاں اجلے اجلے یونیفارموں میں گڑیوں جیسی بنی سنوری بیٹھی تھیں۔ ایک بوڑھی اُستانی ہاتھوں میں چھڑی لئے، آنکھوں پر اسٹیل کا کمانی دار عینک چڑھائے انہیں پڑھا رہی تھی۔

"جانور تین قسم کے ہوتے ہیں۔"

"جانور تین قسم کے ہوتے ہیں۔" بچوں نے دہرایا۔

"پالتو، مویشی اور درندے۔"

"پالتو، مویشی اور درندے۔" بچیاں بولیں۔

"خرگوش، سفید چوہے، گلہریاں اور کتے پالتو جانور ہیں۔"

"خرگوش، سفید چوہے، گلہریاں اور کتے پالتو جانور ہیں۔" بچیوں نے پھر دہرایا۔

میں آگے بڑھ گیا اور اسکول کے پچھواڑے راستے سے پھر سڑک پر آگیا وہ سڑک داہنی طرف سے وادی کو جاتی تھی اور بائیں طرف سے ٹیبل لینڈ کو۔ میں ٹیبل لینڈ کو چل پڑا۔

سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا راستہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ میں دم لیتا ہوا اُس پر چلتا رہا۔ ٹیبل لینڈ پر جوں ہی میں پہنچا، مجھے یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی، گھاس ہوا کے نرم دباؤ سے جُھک جُھک جاتی تھی، دور دور تک آسمان ہی آسمان تھا، نیلا جس کے نیچے سفید سفید بادل اُڑے چلے جارہے تھے۔

میں آگے بڑھا، زمین میں نصب ایک تختی نظر آئی جس کے داہنی جانب لکھا تھا "کھیل کا میدان" اور بائیں جانب لکھا تھا "بھیم کا چولہا"۔ میں بھیم کے چولہے کی طرف چل پڑا۔

وہ ایک گہرا غار تھا۔ غار میں اترنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ نیچے اُتر کر میں نے دیکھا کہ تین بڑے بڑے وزنی پتھروں پر لوہے کی ایک بہت بڑی دیگ رکھی ہوئی ہے اور دس گز لمبی کرچھی اس میں پڑی ہے۔ میں بڑے غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر مجھے حیرت سی ہونے لگی۔ کیونکہ بھیم کے اس چولہے کی ساخت میری سمجھ میں نہیں آرہی

تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس چولہے میں ایندھن کے استعمال کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔
وہ دیگ جن پتھروں پر رکھی ہوئی تھی، اُن تینوں پتھروں کے بیچ میں خلا تھا۔

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا، مجھے اس خلا میں ایک بستی نظر آئی... میں اب بستی میں پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے لگا۔ غار کے ایک نیم تاریک کونے میں مجھے سیڑھیاں دکھائی دیں، میں ان پر سے دھیرے دھیرے اترنے لگا۔ میں سیڑھیاں اترتا گیا.... اترتا گیا یہاں تک کہ اس بستی میں پہنچ گیا۔

مکانوں کی چھتیں ٹوٹی ہوئیں، کھڑکیوں اور دروازوں کے کوئی آثار نہیں ننگ دھڑنگ بچے کیچڑ میں کھیلتے ہوئے، عورتیں کنویں پر کاموں میں مشغول۔ سبوں نے میری طرف دیکھا، عورتوں نے اپنا کام روک کر اور بچوں نے اپنا کھیل چھوڑ کر۔

میں آگے اور آگے بڑھتا گیا۔

ایک جھونپڑے سے مجھے جانی پہچانی سی مہک آئی۔ میں اندر داخل ہوا۔ ایک بوڑھی اپنے سامنے پیتل کا ہنڈہ لئے اُکڑوں بیٹھی تھی۔

"نمسکار" ــــــ "نمسکار" وہ بولی۔

"ایک پاؤ سیر دینا" میں نے جیب سے مڑا تڑا ایک روپے کا نوٹ نکال کر اُسے دیا۔

اُس نے ہنڈے میں سے مشروب گلاس میں اُنڈیل کر مجھے دے دیا۔ ایک ہی سانس میں میں اسے چڑھا گیا۔ نمک چکھ کر میں جھونپڑے سے باہر آگیا۔

بچے کھیل رہے تھے، عورتیں اپنے کاموں میں مشغول، مرغیاں اِدھر اُدھر چُگ رہی تھیں۔

میں کیچڑ سے بچتا آہستہ آہستہ راستہ طے کرنے لگا۔

وہ راستہ ایک پختہ سڑک سے جا ملا۔ سڑک داہنی طرف سے وادی کو جاتی تھی۔
اور بائیں طرف سے بازار کو۔

میرا سر بھاری ہو چکا تھا۔ چلتے چلتے میں تھک چکا تھا۔
سورج کافی دیر پہلے نکل آیا تھا اور تقریباً میرے سر پر تھا۔
اور اب وسلنگ اسکول ہوائے کی سیٹی کی ہلکی سی لہر بھی میرے کانوں میں نہ
تھی کہ جس کو سن کر میرے دل میں اُمنگ جاگا کرتی تھی، اس کے باوجود . . . .
میں بازار کی سمت چل پڑا۔

راستے میں مجھے چند لوگ نظر آئے، وہ بین کرتے چلے آرہے تھے۔ اُن کے
چہرے ستے ہوئے، آنکھیں سوجی ہوئیں اور لباس چرمرائے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں
روکنے اور ان کا حال جاننے کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے میری طرف کوئی توجہ
نہ دی، بس آگے ہی آگے روتے روتے بڑھتے گئے۔

اُن کا نوحہ سن کر میرا دل بھاری ہو گیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ ہو چکا
ہے کہ جس کا دھڑکا مجھے لگا رہتا تھا۔ پھر جیسے کوئی میرے سینے پر موٹی موٹی رسیوں کا جال
بُننے لگا اور گانٹھوں پر گانٹھیں لگانے لگا۔ میری آنکھوں میں کئی موتیں گھوم گئیں اور مرنے
والوں کی یاد کے ساتھ اپنی تنہائی کا خیال۔ زندہ رہتے ہوئے جدائی اور مر کر بھی جدائی!
میرا دل بیٹھنے لگا۔

. . . . پھر وہ مقام بھی آگیا کہ جہاں پہنچ کر میری قوت سلب ہو گئی۔ لمبے لمبے
درخت تھے، ان میں کوئی خم نہیں تھا، ان کی پتیاں نوکیلی اور ٹہنیاں سیاہ تھیں۔ وہ

بے شمار درخت تھے۔ اور اُن کا دو رویہ سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

مجھے یاد آیا، میں یہاں سے پہلے بھی گزر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار گزرا ہوں۔ رات کے اندھیرے میں یا شام کے دُھندلکے میں اور ہر بار مجھے یہ دھڑکا لگا رہا ہے کہ

کچھ نہ کچھ ہو گا.... کچھ نہ کچھ ہو گا۔

تو پھر میں اپنی حفاظت کی تدبیریں کرنے لگتا۔

میری دائیں طرف چٹانیں تھیں۔ میں اُن پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔

بائیں طرف کچھ فاصلے پر گھاٹی تھی، بس وہی ایک سمت تھی کہ جس رُخ میں اپنے بچاؤ کی خاطر دوڑ سکتا تھا۔ ٹھیک اِن ہی لمحوں میں مجھے اچانک یاد آیا.... گرجا میں خطبہ ہو رہا تھا۔ اور پادری کہہ رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ سمندر کی جانب سے ایک عفریت چلا آ رہا ہے۔ اس کے دس سر تھے... نہیں نو... نہیں سات.... بہرحال کئی سر تھے اور ان سروں پر دس نہیں بیس.... نہیں کئی سینگ تھے.... اور ہر سینگ پر ایک تاج ... کئی تاج ... بے شمار تاج رکھے تھے.... اور ان پر ننگی تصویریں کندہ تھیں.... نہیں گالیاں لکھی تھیں.... نہیں ڈراؤنی صورتیں بنی تھیں.... نہیں اِن تاجوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ جو اس عفریت کی پیشانی سے جہاں اس کی آنکھوں میں دھار بن کر داخل ہو رہا تھا۔ اور وہ عفریت خدا کو فحش گالیاں دے رہا تھا۔ اور اپنا لمبا نیزہ ہاتھوں میں اٹھائے بستی کو دکھا رہا تھا۔

اور بستی والے اپنے بے در کے مکانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔

"سنو تمہارے کان ہوں تو" پادری کہہ رہا تھا۔

پھر مجھے وہ اسکول یاد آیا۔ اس کا خوشنما کلاس روم اور اس میں بیٹھی ہوئی پھول جیسی بچیاں اور وہ مدقوق چہرے والی استانی اسٹیل کی کمانی دار عینک چڑھائے، ہاتھوں میں چھڑی تھامے انہیں پڑھا رہی تھی۔ جانور تین قسم کے ہوتے ہیں۔۔۔ نہیں دو قسم ۔۔۔ صرف ایک قسم کے۔۔۔ پالتو۔۔۔ مویشی۔۔۔ درندے۔۔۔ مویشی ہوتے ہی نہیں صرف درندے۔۔۔ درندے ہی درندے۔۔۔

کتے، سفید چوہے، گلہریاں"

نہیں کتے۔۔۔ کتے۔۔۔ کتے۔۔۔ مضبوط جبڑوں اور نکیلے دانتوں والے خونخوار پنجوں والے۔

پھر مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ ایسی کہ چٹانوں پر خراش ڈال دے پھر مجھے دھماکہ سنائی دیا۔ لیکن چیخ اور دھماکے سے پہلے۔۔۔ میں نے یاد کیا۔۔۔ جب میں اپنے آپ سے درندے اور جانور کی بحث میں الجھا ہوا تھا۔ ہوا میں کوئی سنسناتی چیز گزری تھی۔

شوں۔۔۔ آں۔۔۔ ں۔۔۔ کرتی۔ خاموشی کا جگر چیرتی۔

میرا دل دہل گیا۔

اب خوف مجھ پر مکمل غلبہ پا چکا تھا۔ میں نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی دبکا تو نہیں بیٹھا، کوئی گھات میں تو نہیں؟ پھر وہ سنسناتی آواز۔۔۔ وہ چیخ۔۔۔ وہ دھماکہ۔۔۔ میں اچانک دوڑ پڑا۔ میری آنکھوں میں منظر دھندلا ہو چکا تھا۔ یا تو میرے سامنے غبار تھا۔ یا دھند تھی۔ میں دوڑتا رہا۔۔۔ دوڑتا رہا۔

مجھے اپنے تعاقب میں کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔۔۔ وزنی بوٹوں کی۔۔۔

پھر منظر ذرا دیر کے لئے صاف ہوا۔

وہی لوگ میرے سامنے سے چلے آرہے تھے . . . وہ دھاڑیں مار مار کر رو

رہے تھے ۔ میں بھاگتا رہا . . . . بھاگتا رہا ۔

مَیں نے ہانپتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ بیوی نے دروازہ کھولا ۔

"کیا ہوا ؟ خیریت تو ہے . . . آپ رو کیوں رہے ہیں ؟"

تب کہیں جا کر مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں نم ہیں ۔ میں نے قمیص کی آستین

سے آنکھیں پونچھیں اور کمرے کا جائزہ لینے لگا ۔ ہر چیز اپنی جگہ پر محفوظ تھی . . . میں دوسرے

کمرے میں پہنچا ۔ میرا بیٹا بستر پر پڑا تھا ۔ میں نے کھُلا ہوا بلینکٹ اس کے سینے پر سرکا دیا ۔

"کہاں گئے تھے آپ ؟"

مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔

"ابّا کہاں گئے تھے آپ ؟"

"اوں . . . سیر کرنے ۔"

"مجھے کیوں نہیں لے گئے ؟"

"اوں . . . کل چلیں گے ۔"

"یہ تو آپ کئی دنوں سے کہہ رہے ہیں ۔ آپ ہر روز سیر کو جاتے ہیں اور مجھے

ساتھ نہیں لے جاتے ۔"

اب مَیں اُسے یہ کیوں کر بتاؤں کہ میری سیر کتنی کٹھن ہوتی ہے ۔

"نہیں کل ضرور ساتھ چلیں گے ۔"

دوسرے کمرے میں بیوی نے چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا ۔

"رات بھر اسے بخار رہا . . . بڑبڑاتا رہا . . . آپ تو خراٹے بھرتے رہے ۔"

"بس... بس... چائے پینے دو۔"

"ہمیں یہاں آئے کئی مہینے ہو گئے۔ یہ اب تک اچھا نہیں ہوا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ ہم اپنے بیٹے کو شہر سے دور کسی پُر فضا مقام پر لے جائیں کہ جہاں اسے تازہ ہوا اور فطری ماحول نصیب ہو۔ یقیناً وہ وہاں صحت یاب ہو جائے گا۔

کچھ ہفتوں سے اپنے بیٹے کے سرہانے بیٹھے بیٹھے اکثر راتوں کو سوچا ہے۔

یا خدا اسے کونسا روگ لگ چکا ہے کہ یہ دن بہ دن گھُلتا ہی جا رہا ہے۔

بخار ہے کہ اُترتا ہی نہیں، مُردنی ہے کہ چھائی چلی جا رہی ہے۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "بہت دن ہوئے ہیں ہمیں یہاں۔"

"ابا۔"

"آیا بیٹے۔" میں نڈھال قدموں سے اس کے کمرے میں چلا گیا۔

"ابا، آپ نے وسلنگ اسکول بوائے کو آج سنا تھا۔"

"نہیں بیٹے" میں نے جھوٹ بولا۔

"ابا... آج صبح وہ ایسے وِسل کر رہا تھا۔ اس نے سیٹی بجانے کے انداز میں اپنے ہونٹ سکوڑے۔

"فی... فی... فی فوں... فی... فی... فی فوں۔"

اس کی سیٹی سُن کر میرے دل میں اُمنگ سی جاگی اور میں اپنے آپ کو پھر سے سیر کے لئے آمادہ کرنے لگا۔

دوپہر ہو چکی ہے۔ میری بچی اسکول سے لوٹی ہے اور اپنا بستہ رکھ کر پڑوس

میں اپنی سہیلی کے ساتھ کھیلنے چلی گئی ہے۔

میرے بیٹے فرید کی آنکھ لگ چکی ہے۔ وہ کھڑکی کی جانب رُخ کر کے سویا ہے۔ کھڑکی سے اسے ہرے بھرے درخت، اُڑتے ہوئے پرندے اور بادل دکھائی دیے ہوں گے وہ ان کو اپنی آنکھوں میں چھپائے سویا ہو گا۔

میں رسوئی میں بیٹھا ہوں، بیوی روٹیاں سینک رہی ہے۔

"اب آپ نے دن میں بھی پینی شروع کر دی ہے۔"

"اوں۔"

"اپنی حالت دیکھیے... ہاتھوں میں لرزہ پیدا ہو چکا ہے۔"

وہ سچ کہہ رہی تھی۔

چائے کا کپ تھامتے ہی میرا ہاتھ کانپنے لگا تھا۔

میں نے اپنا جائزہ لیا تو مجھے اپنے آپ پر ترس آیا۔ میں باہر سے بڑا صحیح سالم تھا۔ لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

کھوکھلا ہو گیا تھا۔

پتہ نہیں کب بیٹھ جاؤں!

میں اُٹھا اور میں نے ہولے سے بیوی کی کلائیاں تھام لیں اور بولا۔

"نہیں اب کبھی... تمہیں.... دکھ نہ دوں گا۔"

میری آواز بھرا گئی۔

"ابّا۔"

میری بچّی باہر سے چیخی اور دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

مَیں نے بیوی کے ہاتھ چھوڑ دیے اور بچّی کی طرف متوجہ ہوا۔
وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں کچھ تھامے ہوئی تھی۔
"ابّا... یہ دیکھیے۔"
یہ کہہ کر اس نے اپنی ہتھیلیاں پھیلا دیں، ان میں ایک خوش رنگ پرندہ بے جان پڑا تھا۔
"بیٹے... بیٹے... یہ تو... یہ تو... وسلنگ اسکول بوائے ہے۔"
"ہاں ابّا یہ تو..."
پھر میں اپنی بیٹی کو دیکھنے لگا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور آواز گلوگیر ہو چکی تھی۔
میں نے اپنے بیمار بیٹے کی طرف چپکے سے نگاہ کی... وہ سویا ہوا تھا۔
"بیٹی:... فرید سے نہ کہنا کہ...."
اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔
پھر میں بغیر کھانا کھائے صبح کے راستے پر چل دیا۔
اُس دن میں نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔
رات دیر گئے جب میں بستی سے گھر کی طرف چلنے لگا، تو مجھے آسمان میں روشنی سی نظر آئی۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو ٹھیک اُسی جگہ کہ جہاں بھیم کا چولہا بنا تھا، آگ دہک رہی تھی۔
اور متعدد سروں والا عفریت کہ جس کے سر پر ہیرے جگمگا رہے تھے۔
اُس دیگ میں کر چھی چلا رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ پھر پلٹ کر میں نے بستی کی اور دیکھا وہ خاکستر ہو چکی تھی۔

پھر فضا میں لوگوں کی ہچکیاں اور دھیرے دھیرے رونے کی آواز اٹھی جو رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔

میں نے دیکھا کہ وہی لوگ بین کرتے ہوئے مخالف سمت سے چلے آرہے ہیں ـــــ جب میں گھر پہنچا تو سب جاگ رہے تھے۔

مَیں نے کپڑے بدلے کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

جب بتی بند کر دی گئی، تو میں نے اندھیرے میں پوچھا:

"بچّو!"

"اوں"! اس اوں میں دونوں کی آواز شامل تھی۔

"کہانی سنو گے؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُن کی چُپ سے کمرے کا اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا۔

اگلے دن میری بچّی بھی بستر سے جا لگی۔

میری بیوی نے کہا۔

"فرید تو اچھا نہیں ہوا، اب غزالہ بھی بیمار پڑ چکی ہے اور یہاں بھی شوں شاں کی پُراسرار آوازیں بار بار آتی سنائی دینے لگی ہیں اور دھماکے ہیں کہ ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

اب ہمیں... کہیں اور چلنا چاہیئے۔ کسی دوسرے مقام پر۔"

"ہاں۔"

میں نے بہت ٹھہر کر کہا۔ اس میں بڑی کٹھنائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

"لیکن یہ تو بتایئے کہ وہ لوگ کون ہیں جو ویران راستوں پر روتے ہوئے گزرا کرتے ہیں؟"

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا اور اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

"بتاتے کیوں نہیں؟ وہ لوگ کون ہیں جو ویران راستوں پر روتے ہوئے گزرا کرتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم ۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم ۔۔۔۔"

"نہیں ۔۔ آپ کو پتہ ہے۔ لیکن آپ بتاتے نہیں۔"

"نہیں فاطمہ ۔۔۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو بتا دیتا ۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔ میرے خیال سے،، میں دکھی سوچ میں پڑ گیا۔

پھر بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم آواگون پر یقین رکھتی ہو؟"

"آواگون پر ۔۔۔ ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق بار بار مرنے اور جنم لینے کے سلسلے پر؟"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"ہاں" میں نے کہا "یہ رونے والے ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اپنے پچھلے جنم میں وسلنگ اسکول بوائے رہے ہوں گے،

اور اس جنم میں اُن کی نسل کشی پر آہ و فریاد کرتے ہوں گے۔"

یہ سن کر میری بیوی میرے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

منو کی ارتھ ہین یاترا

منّو نے پسینے میں تر چہرہ انگوچھے سے پونچھا، پھر ہاتھ کی اوٹ سے سامنے دیکھنے لگا۔ دور دور تک راستہ اساڑھ کی دھوپ میں تپ رہا تھا۔ چاروں طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی اور ایک عجیب سا سنّاٹا فضا میں گونج رہا تھا۔

"کہاں چلے گئے وہ لوگ؟"

منّو بڑبڑایا۔ پھر لٹھ ٹیکتا آگے بڑھنے لگا۔ اُس کی بڑبڑاہٹ جاری رہی۔

"جنم سے کسی نہ کسی کے پیچھے چلتا آرہا ہوں۔ ہمیشہ کسی نہ کسی راہ دکھانے والے کی ضرورت رہی ہے۔ ساٹھ پر آٹھ برس بیت چکے ہیں، سو وہ ضرورت آج بھی ہے۔ اب جو مجھے کوئی راہ دکھانے والا نہ ملا تو باقی جیون کیسے کٹے گا؟"

'باقی جیون؟' منّو نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

'بٹے کھاتے میں لکھا سمجھ۔ اب جیون چالیس پچاس کے پیٹے میں لکھا جاتا ہے تمہارے اُس جنم میں اور اِس جنم میں زمین آسمان کا فرق ہے'

بات کھری تھی۔

اِس جنم میں منّو کی واقعی کایا پلٹ ہوگئی تھی!!

اُس جنم کے مارگ درشک مُنو نے اِس جنم میں دوسروں کی تابع داری قبول کرلی تھی۔

اوروں کی اطاعت میں رہنے، اُن کی ہدایتوں پر عمل کرنے کو اپنی زندگی کا بنیادی اصول بنا رکھا تھا۔

اُس کا ایمان تھا کہ دوسروں ہی سے سیکھ سیکھ کر اپنا گیان بڑھایا جا سکتا ہے۔ اپنی کمیوں اور خامیوں کو اوروں ہی کے مشورے سے دور کیا جا سکتا ہے۔

اِس اصول پر مُنو بڑی باقاعدگی سے عمل کرتا آیا تھا۔ اس نے قدم قدم پر دوسروں کی تقلید کی تھی۔ بس منزل منزل اپنے قائد بدلتا رہا تھا۔ ان قائدین کی فہرست یقیناً لمبی تھی۔ جیسے:

گھٹنوں چلنا سِکھانے والا،

بولنا سکھانے والا،

انگلی تھام کر چلنا سکھانے والا۔

مَنُو جب پاٹھ شالا میں پہنچا تو اُسے سبھی اکشر ایک سمان سے لگے۔ ان میں تمیز کرنا اُسے اتنا ہی دشوار گزرا جتنا کہ مختلف اناجوں کے مشترکہ ڈھیر میں سے ہر اناج کو الگ کرنا۔ جب گروجی نے اُن اکشروں کا تعارف مُنو سے کرایا، تب کہیں جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ رام کی 'را' اور لکشمن کی 'لا' میں کیا فرق ہے۔ ساتھ ہی سنکھیا کا یہ رہسیہ بھی مَنو کو گروجی ہی نے بتایا کہ کسی انک کے آگے شُنیہ لگانے سے سنکھیا آگے بڑھتی ہے اور شُنیہ پیچھے لگانے سے سنکھیا گھٹتی ہے۔

جس راستے پر مَنو چل رہا تھا، وہ بڑا اوبڑ کھابڑ تھا اور کچّا ہونے کی وجہ

سے پیدل چلنے کے قابل نہ تھا۔ شہر کو جانے والی بیل گاڑیاں اسی راستے پر سے گزرا کرتی تھیں۔ کوس ڈیڑھ کوس آگے یہ راستہ پختہ سڑک سے جا ملتا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو منّو کا جیون بھی بڑا ناہموار اور ویران تھا، جس پر اس سرے سے اُس سرے تک دُکھوں نے کانٹے بچھا رکھے تھے۔ یہ دُکھ ہی تو تھے جن کے اُپائے کی تلاش میں وہ ہر کس و ناکس کے پاس پہنچا اور ان سے ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا گُر سیکھتا رہا۔ جیسے

کھیتوں سے آلو چُرانا،

ڈھور ڈنگر چرانا،

بنسی بجانا،

ساہوکاروں کے چرن چھونا،

اُن کے لئے ہانکا لگانا۔

گرہستی کے پھیر میں منّو بھی پڑا لہٰذا اپنا بوجھ بڑھا بیٹھا۔ اس کے باوجود منّو کے سیکھنے کا عمل جاری رہا۔ جیسے۔

گرہستی کے گُر اُسے بیوی نے سکھائے، اور

سنجھوگ کے آسن دوستوں نے!

کھیتوں کی جُتائی اور فصل کی سینچائی کا ہُنر اس نے کس سے سیکھا؟

اُسے یاد نہ رہا۔

شہر کی منڈی کا کاروبار لاکھ کوشش کے باوجود اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ جب سمجھ ہی میں نہ آیا تو منّو وہ کاروبار سیکھتا کیوں کر؟

چوپایوں کا میل کرانا،
ان کے کھُروں میں نعل لگوانا،
اُنہیں اشاروں پر چلانا، اور
ناکارہ ہونے پر اُنہیں قصائی کے ہاتھ بیچ دینا۔

یہ اور ایسے کئی گُر منّو نے جن جن سے سیکھے تھے، اُن اُن کے نام اس کے ذہن میں اب بھی محفوظ تھے۔

دھرم کرم کی باتیں اس نے پروہتوں سے سیکھیں۔ پروہتوں نے اپنی پوتھیوں کے حوالے سے منّو کو بتایا،

مَنُشیہ کا کرم اُسے ہمالہ سے اونچا اٹھا سکتا ہے اور مَنُشیہ اپنے کرم ہی کے کارن کسی کیڑے سے بھی ہین ہو سکتا ہے! اگر تو یہ کا پالن کرنا ہی منشیہ کا دھرم ہے۔ دُکھ سُکھ، ہار جیت اور لابھ شُبھ کی سَم بھاونا دِل میں لائے بِنا مَنُشیہ کو اپنا کرم نبھانا چاہیے۔

کام، کرودھ، لوبھ، مایا اور اہنکار سے بچ کر منشیہ کو نِروان پراپت کرنا چاہیے۔"

پروہتوں کے اِن آدیشوں پر منّو نے بڑی لگن سے عمل کیا اور ایک سُکھی سادھارن جیون گزارنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود اس کے دُکھوں میں کمی واقع نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ بس منّو تھا اور ساتھ تھے اس کے انیک دُکھ۔

منّو کو بچپن ہی سے چھوٹی موٹی باتیں سوچنے کا خبط تھا۔ سوچ کا یہی عمل دراصل منّو کے دکھوں کی بنیاد تھا۔

دن بھر منّو محنت مشقت کرتا اور رات کو اپنے آنگن میں کھٹیا پر لیٹا لیٹا

مختلف باتیں سوچا کرتا۔ جیسے آکاش کا انت کہاں ہوگا؟ اُس کے آگے کیا ہوگا؟ آکاش میں کتنے تارے ہیں؟ جب تارے بیشمار ہیں تو چاند ایک ہی کیوں ہے؟ ان کی روشنی ٹھنڈی ہے تو سوریہ دیوتا میں اتنا تیج کیوں ہے؟

چنگھاڑتے چلاتے بادلوں کو دیکھ کر منّو خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا اور لگاتار برستا مینہ اُسے اُداس کر دیا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ جو ندی اس کے کھیتوں کی پیاس بجھاتی ہے، وہی ندی کھڑی فصل کو کیوں کر پچھاڑ دیتی ہے!

اسے یہ بھی فکر تھی کہ گاؤں میں جب وبا پھیلتی ہے تو لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے لگتے ہیں اور جب تھمتی ہے تو گاؤں میں بھک مری اور ناداری بڑھ جاتی ہے ——

اسے کھیت مزدور کا ساہوکار سے اور ساہوکار کا شہر کی منڈی سے جڑا ہوا سمبندھ کبھی سمجھ میں نہ آتا!

اُس کے لئے یہ مسئلہ بھی پریشان کُن تھا کہ آدمی کی پیدائش پر تو گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں لیکن جوں ہی آدمی مرتا ہے توں ہی منوں لکڑی کے نیچے دبا کر اسے خاک کر دیا جاتا ہے!

یہ اور ایسی کئی باتیں جب بار بار سوچنے پر بھی منّو کی سمجھ میں نہ آتیں تو منّو دکھی ہو جاتا اور کھاٹ پر پڑے پڑے دور ٹمٹماتے تاروں پر نظریں گاڑے اپنی بے بضاعتی اور کم سمجھی پر کُڑھتا۔ کبھی کبھار دکھ کے بوجھ سے اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

منّو نے مندر جانا، پوجا پاٹ کرنا، عرصہ ہوا ترک کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آنگن میں لیٹے لیٹے جن باتوں پر وہ وچار کرتا ہے اُن وچاروں کے پیدا کردہ دکھوں

کو بھوگتا ہے۔ دراصل وہی اُس کی تپسیّا ہے، وہی اُس کی آرادھنا ہے۔

ایک دن گاؤں کے سرپنچ نے منّو کو بتایا۔

"ایک بڑے گیانی دھیانی مہاراج یاترا پر نکلے ہیں۔ اُن کا گزر اپنے گاؤں سے ہونے والا ہے۔ ہزاروں لوگ ان کے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ جہاں جہاں سے مہاراج گزریں گے، وہاں وہاں کے لوگ اُن کے ساتھ ہوتے جائیں گے۔ بڑی مہان یاترا ہے یہ اُن کی۔ جس کسی نے ان کے ساتھ یہ یاترا پوری کرلی، مانو اس کے دکھوں کا ناش ہوا۔ مانو اس کی جیون یاترا سپھل ہوئی۔"

یہ سُن کر منّو اچنبھے میں پڑگیا۔ اُس رات منّو اپنے آنگن میں لیٹا لیٹا سوچتا رہا، یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ میری سمسّیاؤں کا حل اس کے پاس ہو؟ میری طرح اُن ہزاروں کی سمسّیائیں ہوں گی، اُن سبھوں کا حل اس کے پاس ہوگا؟ یہ ناممکن ہے۔

جیون کے انیک بھید منّو پر نہیں کھلے تھے۔ یہ بھید ان سبھوں سے زیادہ گہرا تھا وہ بار بار سوچتا کہ سبھوں کی سمسیاؤں کا حل کسی ایک کے پاس ہو یہ ممکن نہیں!

سوچتے سوچتے آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا۔

ہزاروں اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں یقیناً اس میں بڑی گیانتا ہوگی۔ وہ بڑا وِدوان ہوگا۔ ممکن ہے کوئی چمتکار ہی ہو اُس کے پاس، جس کے بل پر وہ سبھوں کے دکھ دور کردے...

... میں تو یوں بھی جنم سے کسی نہ کسی کے پیچھے چلتا آرہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی مارگ درشک کی آوشیکتا رہی ہے۔ منزل دو منزل اُس کے پیچھے چلنے میں کوئی حرج نہیں...

اگلے دن منہ اندھیرے منّو گاؤں کے سرے پر جا کر کھڑا ہوا اور اُس گیانی کی راہ تکنے لگا۔ سورج جب سر پر چڑھ آیا تب کہیں منّو کو ایک آدمی مٹیالے رنگ کا انگرکھا پہنے ہاتھ میں لٹھ تھامے، اپنے گاؤں کی اُور آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہزاروں لوگ چلے آ رہے تھے وہ قافلہ جب منّو کے قریب سے گزرنے لگا، تب منّو بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔

اگلے پڑاؤ پر اُس کی بھینٹ اپنے گاؤں کے سرپنچ سے پھر ہوئی۔ جانے کب وہ یاتریوں میں شامل ہوا تھا۔ اس دوران میں چند مزید باتیں اس نے معلوم کر لی تھیں وہ باتیں اس نے منّو کو بتائیں، اُتّر کی دِشا میں ایک شہر ہے۔ اس شہر میں لوہے کے بنے ہوئے کئی مضبوط قلعے ہیں۔ اِن قلعوں میں اس جگ میں جاری چھوٹے بڑے، نئے پرانے، غرض کہ ہر قسم کے کاروبار کے کھاتے محفوظ ہیں۔ مہاراج کا کہنا ہے کہ اِن کھاتوں کے اندراج میں جب جب بدنیّتی کو دخل ہوتا ہے، تب تب اس جگ کے دُکھوں میں اضافہ ہوتا ہے اور سُکھوں میں کمی واقع ہوتی ہے، مہاراج کو یقین ہے کہ پچھلے دنوں اِن کھاتوں میں پھر گھپلا ہوا ہے۔ جس کے کارن دُرویوستھا کو پربندھ اور اشانتی پھیلی ہے۔ کھاتوں کی کڑی جانچ کا سمے آ پہنچا ہے۔ مہاراج سوئم اُن کھاتوں کی جانچ کریں گے۔ اُن میں کی گئی غلطیوں کو درست کریں گے یا ضروری ہوا تو تمام کھاتے نئے سرے سے خود لکھیں گے۔

منّو کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی حیرت کا احساس سرپنچ کو یوں ہوا کہ بغیر کچھ بولے اپنا منہ کھولے کھڑے منّو کو وہ بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔

اس شہر میں پہنچتے پہنچتے انہیں کئی دن لگ گئے۔ شہر کی شان و شوکت دیکھ کر

منو حیران رہ گیا۔ باغ باغیچے، نہریں اور فوارے، ہرے بھرے درخت، بولتے گاتے پرندے، جگمگاتی سڑکیں، دوڑتی بھاگتی سواریاں، جھلملاتی روشنیاں، چاق و چوبند فوجی اور لوہے کے بنے مستحکم قلعے۔ بڑی حسین اور پُرکیف جگہ تھی وہ!

مہاراج، منو سمیت ہزاروں شردھا والوں کے ساتھ شہر کے مرکزی قلعے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ انہوں نے قلعے میں سندیش بھجوایا کہ جگ میں پھیلی ہوئی دُردیوستھا کو پربندھ اور اُشانتی کو دور کرنے ہم حاضر ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ پچھلے دنوں بھر کھاتوں میں خورد بُرد ہوا ہے، جس کے کارن جگ بھر میں دکھوں کا روگ پھیلا ہے۔

مہاراج کو تُرنت قلعے میں کھاتوں کی جانچ پڑتال کا نِمن ترن دیا گیا۔

ایک جہاز نما گاڑی قلعے کے داخلی دروازے سے نکلی، پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی مہاراج کے قریب آئی۔ مہاراج اس پر سوار ہوئے، پھر انہوں نے اپنے شردھا والوں سے ہاتھ جوڑ کر بدائی چاہی۔ شردھا والوں نے انہیں اپنی شُبھ کامناؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ گاڑی دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ اپنے مارگ درشک کی ایسی پرتِش ٹھا دیکھ کر منو کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔ گاڑی مہاراج کو لے کر قلعے کے قریب پہنچی۔ دروازہ کُھلا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی۔ قلعے کا دروازہ حسب دستور بند ہو گیا۔ منو اپنی جگہ پر قائم ٹکٹکی باندھے قلعے کی اُور دیکھتا رہا۔

منو کو ہر چھن یہی گمان رہا کہ اب وہ دروازہ کُھلے گا اور اب وہ گیانی باہر آکر مژدہ سنائیں گے کہ دکھ کے بادل چھٹ چکے ہیں اور سُکھ کا ساون آیا ہے۔

ایک دن واقعی مینہ برسنے لگا۔ میدان میں کھڑا منو بھی بھیگنے کا لطف لے ہی رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اُسے اچانک احساس ہوا کہ اسے اُس

میدان میں کھڑے کھڑے زمانہ بیت چکا۔ نہ تو قلعہ کا دروازہ ہی کھلا اور نہ مہاراج ہی قلعہ سے باہر پدھارے۔ منو نے جب اپنے دائیں بائیں نظر کی تو یوں چونکا، گویا کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو! دور دور تک میدان ویران پڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر چند گدھ کسی مردار کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ "کہاں چلے گئے وہ لوگ، کہاں چلے گئے؟"

منو بڑبڑایا۔

اب منو کو اپنی غفلت کا شدید احساس ہونے لگا۔ بڑی دیر تک وہ وہیں کھڑا کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرے؟

اس کے سامنے بس دو ہی صورتیں تھیں۔ مہاراج کا مزید انتظار یا اپنے گاؤں کو واپسی۔

مہاراج کے انتظار کی اُس میں سکت نہ تھی۔ وہ پژمردہ ہو چکا تھا۔

گاؤں لوٹنے ہی میں منو نے بہتری سمجھی۔ سو منو اپنے گاؤں کو روانہ ہوا۔

کئی دنوں کی مسافت کے بعد منو اپنے گاؤں پہنچا۔

چوپال میں اسے وہ سرپنچ نظر آیا۔ جانے کہاں جا رہا تھا؟

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا،

کچھ پوچھنے کے لئے دونوں کے لب کھلے، پھر جانے کیا ہوا کہ دونوں نے اپنے اپنے لب مضبوطی سے بند کر لئے اور ایک دوسرے کو خطاکاروں کی طرح دیکھنے لگے!

پھر دونوں نے اپنی اپنی نظریں جھکائیں اور تیزی سے مخالف سمتوں میں چل پڑے۔

آج کئی برسوں بعد منو کو اس سرپنچ نے اطلاع دی تھی کہ کوئی مہاپُرش پھر یاترا پر نکلے ہیں۔ ہزاروں یاتری اُن کے ساتھ ہوں گے۔ یاترا پھر اُتر ہی کی دِشا میں ہوگی۔

اُس اُوبڑ کھابڑ کچے راستے پر چلتے چلتے اب منّو سڑک پر آ چکا تھا اور قدرے تیز چلنے لگا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

بچپن سے کسی نہ کسی کے پیچھے چلتا آیا ہوں۔ ہر زمانے میں مجھے کسی نہ کسی راہ دِکھانے والے کی ضرورت رہی ہے۔

ساٹھ پر آٹھ برس بیت چکے ہیں، سو وہ ضرورت آج بھی ہے۔ اب جو مجھے کوئی راہ دکھانے والا نہ ملا، تو میرا باقی جیون کیسے کٹے گا؟

کہاں چلے گئے وہ لوگ۔ کہاں چلے گئے۔

کچھ دیر پہلے منّو حسبِ سابق ان یاتریوں کے ساتھ ہو لیا تھا۔ لیکن اپنی ضعیفی کی وجہ سے ان کی طرح تیز قدموں سے نہیں چل پایا تھا۔ لہذا راہ سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے یاترا جاری رکھی تھی۔

اس سڑک پر ابھی منّو کچھ ہی دور چلا ہوگا کہ اسے مخالف سمت سے ایک شخص آتا دکھائی دیا تو منّو نے دیکھا کہ اُس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرہ دھول میں اَٹا ہوا ہے۔ لباس تتر بتر ہے۔ منّو کو یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ کوئی خستہ حال مسافر ہے اور لمبا سفر طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

"بھائی تم نے کسی قافلے کو راہ میں جاتا دیکھا؟"

منّو نے مسافر سے سوال کیا۔

'قافلہ' مسافر نے استفہامیہ لہجہ میں کہا۔

"ایک مہا پُرش کی قیادت میں جاتا ہوا؟"

'ہاں' منّو بے تابی سے بولا۔ "مٹیالے رنگ کا انگرکھا پہنے، ہاتھ میں لٹھ لئے

وہ ابھی ابھی اُتر کی دِشا میں گئے ہیں ۔"

"اُتر کی دِشا میں ؟" مسافر نے دُہرایا ۔ پھر بولا ۔" میں بھی اُتر ہی کی دِشا سے آ رہا ہوں ۔"

" تو پھر تمہاری بھینٹ ضرور ہوئی ہوگی اُس سے ۔" مُنو نے بڑے وثوق سے کہا ۔

" مہاراج ! یہ کیا فرما رہے ہیں آپ ؟ یہ سوال تو ہزاروں پوچھ چکے ہیں مجھ سے اس راہ میں !" "ہزاروں پوچھ چکے ہیں یہ سوال ... ؟" منو کچھ نہ سمجھتا ہوا بولا ۔

" یقیناً ... مجھے لگتا ہے کہ وہ سارے کسی یاترا پر نکلے تھے اور کسی کی قیادت میں تھے ... جانے کیا ہوا ... ' مسافر خاموش ہو گیا ۔

کچھ لمحوں کے بعد مسافر پھر بولا ۔

' مہاراج مجھے شبہ ہے کہ اُن کا مارگ درشک کہیں اپنی دِشا نہ بھول گیا ہو !

یا ... ؟ '

مُنو مجسّم سوال بن گیا ۔

" یا پھر .. اُس نے اپنے شردھالوں کو ان کے مارگ سے بھٹکا دیا ۔"

مُنو نے زور زور سے اپنی گردن کو دائیں بائیں ، بائیں دائیں حرکت دی اور اپنا لٹھ احتجاجاً زمین پر پٹکتا ہوا بولا ۔

" یہ نہیں ہو سکتا ... وہ کیوں انہیں اپنے مارگ سے بھٹکائے گا ؟"

وہ آپ ہی اپنی راہ چوک گئے ہوں گے ۔

" میں بچپن سے کسی نہ کسی کے پیچھے چلتا آیا ہوں ۔ مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی راہ دکھانے والے کی ضرورت رہی ہے ۔ ساٹھ پر آٹھ برس بیت چکے ہیں ، سو وہ ضرورت آج بھی ہے ۔ میرے دن تھوڑے رہ گئے ہیں ۔ جیون کا اندھیارا مجھے بھٹکا نہ دے ۔

وہ ابھی ابھی میری رہنمائی کر رہا تھا۔ آگے نکل گیا ہوگا، ضرور کہیں راہ میں ہوگا۔

"مجھے جلدی کرنی چاہئے..."

یہ کہتے کہتے منو ٹھ ٹھیکتا آگے بڑھ گیا۔

مسافر نے اسے یوں اچانک جاتے دیکھا تو سپٹپایا پھر بولا۔

"مہاراج! جاتے جاتے اپنا نام تو بتاتے جائیے۔"

ایک لمحہ کے لئے منو نے اپنی چال روکی۔ گردن موڑی اور بولا:

"بچپن سے مجھے گاؤں والے منو کے نام سے پکارتے آئے ہیں، ممکن ہے، یہی نام ہو میرا۔" یہ جملہ جوں ہی مسافر نے سنا، سکتے میں آ گیا۔

منو جب کافی دور نکل گیا، تب مسافر نے اپنی راہ لی۔

وہ بڑبڑا رہا تھا:

"میری جنم پتری میں سچ لکھا تھا کہ میری بھینٹ کسی مہان پُرش سے ہوگی؛ سو آج ہوگئی۔

لیکن

لنگڑا بیساکھی بنا، اندھا لاٹھی بنا،

بالک پِتر و بِنا،

بیسوا یووَن بِنا،

اور

منو رِکشتی بِنا کتنا ویدگرست اور دُربھاگی ہوتا ہے!!"

نیشِ عقرب

(افریقی قبایلیوں میں نامردی دور کرنے کے کئی ٹوٹکے قرنوں
سے مروّج ہیں۔ مریض کو بھرے مجمع میں ذلیل کرنے، سانپوں
اور بچھوؤں سے ڈسوانے، مریض کے مخصوص اعضاء پر نشتر لگوانے،
پھر زخموں پر بندر کا خون پوتنے یا کالے چیتے اور پہاڑی ریچھ کے
پٹھّوں کا جوہر کھلانے کی رسمیں آج بھی عام ہیں۔ یہ افسانہ ایسی
ہی دو رسموں کی بنیاد پر لکھا گیا ہے ______ ا۔ ق)

پٹخ کی آواز ہوئی۔

خُصیے کٹ کر خلا میں ڈوب گئے۔

خون کی پتلی سی لکیر بڑی دور تک ان کا تعاقب کرتی رہی۔ اب وہاں
لجلجی جھلّی کسی سفید چھپکلی کی مانند لٹک رہی تھی، خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور
وہ مکڑی کے پیروں سے کانپ رہا تھا۔

وہ بچھّو اب پروہت کے پاس رکھے مرتبان میں ساکت پڑا تھا، پھن
کاڑھے بیٹھے ناگ کی طرح۔ اس کا ڈنک جب جب لہراتا تو اندازہ ہوتا کہ وہ مُردہ

نہیں بلکہ ایک زندہ بچھو ہے۔

اِس سے پہلے

اُسے ننگا کر دیا گیا تھا۔

پہلے سر سے، پھر سینے سے، پھر کمر سے۔ جوں جوں اسے ننگا کیا جا رہا تھا توں توں اس کی گردن میں رعشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے وہ "نہیں نہیں" کیے جا رہا ہو۔ دو ایک مرتبہ اس نے ایتھر زدہ مریض کی طرح ہاتھ بڑھا کر آخری کپڑے کو اپنے جسم سے الگ ہونے سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ ہَوا اُس کے خُصیوں کو چھو چکی ہے! درجنوں ٹھنڈی سوئیوں کی چبھن اسے محسوس ہو رہی ہے وہ شرمندگی اور خجالت کے زہر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس وقت بھی وہ نہیں بھولا تھا کہ وہ بہر حال ایک ریاست کا حکمران ہے، اور وہ جو اُسے اِن وحشیوں اور گنواروں کی بستی میں ذہنی علاج کی غرض سے چھوڑ گئے ہیں وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ ان میں سے اگر ایک فرد بھی کسی چٹّان کے پیچھے چھُپا یہ تماشہ دیکھ رہا ہو گا تو میری عزّت .... ؟؟ اپنے ملک میں مَیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مَیں اس پہاڑی سے کود کر جان دیدوں۔

جس دم وہ یہ سوچ رہا تھا اس وقت اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس کے نصیب میں دنیا کی بدترین ذلّت لکھی جا چکی ہے۔ ہلکا ہلکا شور اُس کے کانوں سے ٹکرایا۔ مکھیاں بِھن بِھن کرنے لگیں، پھر بِھن بھناہٹ بڑھنے لگی۔ دور کہیں ڈھول بج رہے تھے۔ پہاڑ تالیاں پیٹ رہے تھے۔ اجنبی زبان میں گیت گایا جا رہا تھا۔ ڈھول کی آواز اور مکھیوں کی بھن بھناہٹ رفتہ رفتہ بہت بڑھ گئی۔

وہ قریب آچکے تھے۔

اُس نے سوچا۔

اُن کی تعداد کتنی ہوگی؟

رام لیلا کا میدان، لال قلعہ، چوپاٹی کا ساحل، سیاہ سروں کا ٹھاٹھیں

مارتا سمندر....

اُس نے جلدی سے سنہری فریم کا چشمہ اتارا اور اس کے دھندلے شیشے انگوٹھے سے مل کر صاف کیے۔ اس کے باوجود اُن کی تعداد میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ٹڈی دل کی طرح اس کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ سیاہ فام لوگ، ننگ دھڑنگ لوگ، ڈھول پیٹتے، تاشے بجاتے، تالیاں مارتے لوگ، گیت گاتے لوگ۔

خُصیے خلا میں ڈوب چکے تھے۔ خون کی لکیر کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہاں پر ایک جھلّی پھٹے ہوئے ڈھول کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ بچھو پروہت کے پاس رکھے مرتبان میں ساکت پڑا تھا بس کبھی کبھار وہ اپنا ڈنک لہرا دیا کرتا تھا۔

جب اسے الف ننگا کر دیا گیا تب پروہت نے وہ مرتبان اپنے جھولے میں سے باہر نکالا تھا۔ بچھو مرتبان کی گول گول اور چکنی چکنی دیواروں پر تیزی سے چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے جسم میں خون کی گٹھلیاں بننے لگیں۔ اُسے یاد آیا، بچپن میں اپنے مکان کی سیلن لگی ہوئی موری میں برسات کی ایک شام جب وہ اشنان کر رہا تھا، بچھو نے اسے ڈنک مارا تھا۔ درد پنجے سے بجلی کا کوندا بن کر اٹھا تھا، اور اس کی کنپٹیوں پر پھڑکنے لگا تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑا جب اُسے ہوش آیا تو اس کی ماں اپنی سفید دھوتی کے پلّو سے اس کے ماتھے پر ہوا جھل رہی تھی! اور پیر میں اس کے نارو

کا سا درد ہو رہا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر اپنے خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی، دوسرے ہی لمحے وہ سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا۔

"تم نامرد ہو؟"

پروہت کو اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ کیونکہ خوف و دہشت نے اس کے تمام احساسات معطل کر دیے تھے۔

"تم نامرد ہو یا...."

اب کی بار پروہت نے اس کے شانے جھنجھوڑ دیے۔

غیروں کی بستی میں سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کے سامنے ننگ دھڑنگ کر دیے جانے کی خجالت۔ اپنوں میں سے کسی ایک کے چھپ کر اسے ذلّت کی ایسی پستی میں دیکھ لئے جانے کا خوف اور ان احساسات پر غالب خود کے حکمران ہونے کا خیال اور مرتبان کی چکنی دیوار سے چمٹا وہ بچھو۔ اس کے اعصاب یکے بعد دیگرے ٹوٹنے لگے۔

"تم نامرد ہو یا...."

پروہت غصّے سے اس کے کان میں دھاڑا۔

"ہوں... ہوں... میں نامرد ہوں... میں
آئی ایم امپوٹنٹ.... آئی ایم اے باسٹرڈ...."

"تم نے کتنے عرصے سے مباشرت نہیں کی؟"

"مباشرت؟ مباشرت؟" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں مباشرت یعنی سمبھوگ، جماع، انٹرکورس۔"

وہ یاد کرنے لگا۔

"سمبھوگ .... سمبھوگ .... تو میں نے برسوں سے نہیں کیا۔ برسوں سے .... ہزاروں برسوں سے .... لاکھوں برسوں سے .... یا کبھی کیا ہی نہیں .... کیا ہی نہیں ...."

اُس کے چہرے پر سمبھوگ کے ذکر سے پیدا ہونے والی لذّت اُبھر آئی، اس کی آنکھوں میں جنسی بھوک اب نمایاں ہو گئی۔ وہ مجمع میں کھڑی ایک کسے بدن کی سڈول اور بالا قد لڑکی کو ندیدے کی طرح دیکھنے لگا۔ اس کی زبان اس کے ہونٹوں کو بار بار چاٹنے لگی۔

"اِس کے باوجود تم زندہ کیسے رہے۔ اس تسکین کے بغیر تو تم اِس بچھو سے زیادہ زہریلے ہو چکے ہو گے۔" یہ کہتے کہتے پروہت اس کے اور اس لڑکی کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔

"تمہاری آنکھوں کی یہ زہرناکی، یہ چمک، تمہارے نتھنوں کی یہ پھنکار ثبوت ہے اس بات کا کہ تم انتہائی زہریلے ہو۔"

بھن بھن، اس کے کان کے پردوں پر مکھیوں نے اپنا چھتّا بنا لیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی پلکیں بند ہونے لگیں اور ذہن کے تہہ خانے کے روزن کھلنے لگے۔

نیم تاریک کمرہ تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ اُس کی پیٹھ کی جانب لیٹی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر اس کی انگیا پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کتنی منت سماجت سے اسے راضی کیا تھا۔ دراصل وہ اس سے عمر میں پانچ برس بڑی تھی اور سمجھ بھی زیادہ رکھتی تھی۔ اب یہ کیوں ہوتا تھا کہ اس کا آنچل اس کی نظروں کے سامنے بار بار ڈھلک جاتا تھا اور وہ بار بار گھرے بادلوں میں دوڑتے بھاگتے چاند دیکھا کرتا تھا۔ ایسا

کیوں ہوتا تھا لیکن ہو بہو جاتا تھا۔ کہ وہ جب بھی بیٹھے بیٹھے اس کے سامنے اٹھ کھڑی ہوتی، اُس کا لہنگا دُہرے بل کھا جاتا اور یہ دیکھتا کہ دم دار تارہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا لیکن ایسا ہو ہو جاتا تھا کہ یہ اس کے غسل کے بعد جب بھی غسل خانے میں جاتا تو سب سے پہلے اس کے اتارے ہوئے کپڑوں کو اپنے نتھنوں سے لگاتا۔ ان گولائیوں، محرابوں اور گنبدوں میں رچی بسی گرمی کو اپنے رخساروں اور لبوں سے محسوس کرتا۔ وہ اس کی تایازاد بہن تھی اور اس کے ہاں کچھ عرصے کے لئے پڑوس کے گاؤں سے آکر ٹھہری ہوئی تھی۔

اور اس دوپہر کو کہ جب گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ جس کے بعد اس کی جنسی زندگی پر آتش فشاں کا لاوہ بکھر گیا تھا۔ وہ اس کی پیٹھ کی جانب لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا تنفس تیزی سے چل رہا تھا۔ مخروطی اور مرمریں پستان ڈوب ڈوب کر اُبھر رہے تھے۔ اور وہ اس کی پیٹھ پر ہولے ہولے انگلیاں پھیر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کچھ ہو جائے۔ یہ گھومے اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامے اور پھر تیزی سے مسہری سے اٹھا کر گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دے اور اس سے پہلے کہ کچھ اور ہو جائے یہ اُسے گھوڑے پر لے اُڑے۔ اس قوت سے، اس شدت سے کہ وہ آناً فاناً آسمان کی بلندیوں کو چھولیں۔ پھر ایسا ہو کچھ ایسا کہ وہ گھوڑے کی پیٹھ سے پھسل پڑے اور تتلی کے پروں پر اڑتی ہوئی دھیرے دھیرے ہولے ہولے نیچے چلی آئے اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟

جو درندہ اس کے اندر چنگھاڑ چنگھاڑ کر اُسے طلب کرتا تھا وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ وہ وحشی جو اُس کے کپڑوں کی بُو پاتے ہی بدمست ہو جاتا تھا کہاں

جا چھُپا۔ اور وہ چیتا جو اُس کے پستان کے اوپری سرے اور کمر کی چکنی جلد دیکھ کر پنجے زمین پر مارنے لگتا تھا، اب کہاں ہے؟ نہ تو اسے نوچ کھانے کی خواہش ہو رہی ہے، نہ پھاڑ کھانے کی !!

ایک حیرت انگیز تبدیلی ،

ایک ناقابل بیان کیفیت ؛

ایک ویران انقلاب ۔

ایک تھکا دینے، مایوس اور نامراد کر دینے والی ناکامی! وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اپنے جذبات اور احساسات ٹٹولنے لگا۔ اس نے پھر اس کے جسم کے ہر ہر عضو پر ٹھہر ٹھہر کر نظر ڈالی ۔ سینے میں وہی بھراؤ اور کٹاؤ تھا۔ پیٹ کی گولائی اور ذرا سا اُبھار اور پھر نشیب اور پھر .... پھر گوری گوری چکنی چکنی رانیں اور پھر بھری بھری پنڈلیاں ۔ ... کیا ہوا تھا، کیا ہوا تھا کہ اس کے جسم کا ہر ہر کمرہ تاریک تھا۔ کہیں تو کوئی دِیا جلتا، کہیں تو کوئی روشنی ہوتی !!

نہ تو روشنی ہو رہی تھی نہ کہیں پر تپش ہی کا احساس تھا۔

بس سرد سرد سی لہر تھی جو سر سے پاؤں تک دوڑ رہی تھی ۔

پھر اس کے کان میں آ کر کسی نے کہا ۔

"تم کمر سے نیچے مر چکے ہو۔"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" وہ چلّایا ۔

وہ آواز پھر آئی ۔

"مجھے بذاتِ خود تم پر افسوس ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ تم کمر سے نیچے مر چکے ہو۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو چھُوا۔ واقعی وہ حصہ مرے ہوئے گرگٹ کی طرح سرد و بے جان پڑا تھا۔ اس کے تصور میں آیا کہ رات کا وقت ہے اور بے شمار لوگ ایک لاش کندھوں پر اُٹھائے مرگھٹ کی اور چلے جا رہے ہیں۔ آگے آگے چلنے والوں کے ہاتھوں میں قندیلیں ہیں اور ہوا کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ ارتھی میں شریک ہر آدمی رو رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اچانک بجلی چمکتی ہے اور ساتھ ہی ہوا کا تیز جھونکا بھی آتا ہے اور ارتھی پر ڈھکی چادر اڑتی ہوئی دور چلی جاتی ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر لرز لرز جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے وہ تمام لوگ اسی کے ہم شکل ہیں اور اس ارتھی پر ایک بہت بڑے گرگٹ کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ وہ گھوما۔ پھر اُس نے بڑی آہستگی سے اس کی پیشانی پر اس کی آنکھوں، اس کے رخساروں پر اور اس کے لبوں پر انگلیاں پھیریں۔ گویا اُسے یہ تیقن دلانا چاہتا ہو۔ تم پھولوں کی طرح نازک ہو اور میں تمہیں اپنی پلکوں سے اُٹھانا چاہتا ہوں، تم شہد کی طرح میٹھی ہو اور میں تمہیں بچے کی زبان سے چکھنا چاہتا ہوں، تم تتلی کی طرح حسین ہو اور میں تمہیں ریشم کے جال سے پکڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں کہ میری ہر راہ پر مردہ سانپ پڑے ہیں۔ میرے ہر ارادے کی پیٹھ میں خنجر بھونکا گیا ہے۔ میں کام دیو کی وہ مورت ہوں جو کمر کے نیچے سے ٹوٹی ہوئی ہے!

پھر وہ رو دیا۔

اس بچہ کی طرح کہ جسے ٹھنڈے بستر پر اندھیاری رات میں اپنی آغوش میں اپنی ماں کے نہ ہونے کا اچانک احساس ہو جائے۔

وہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی، اس کی پیٹھ سہلاتی رہی پھر بیتا

نہیں یہ عمل کب تک جاری رہا۔

جب وہ نیند سے جاگا تو کوئی کتّا اُس کے قریب ہی بھونک رہا تھا۔ بھو ... بھو ... بھو ... بھو۔

بے کیفی اس کے دماغ پر چھا چکی تھی اور ذہن پر کچوکے لگا رہی تھی۔

بھو ... بھو ... بھو ... کتّا بدستور بھونک رہا تھا۔

اس نے اپنے سر کو تھام کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ٹیبل پر اب وہ انگیا نہیں تھی۔ اس کا پہلو بھی خالی تھا۔ اور مسہری کے اس حصّے کی چادر کی شکنیں اور تکیئے کی ناہمواری درست کر دی گئی تھی۔ اُسی ٹیبل پر دودھ کا گلاس جالی دار رومال سے ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ اسے اپنی ناکامی پر بڑی ندامت ہوئی۔

اُسے اپنے دوستوں کی باتیں یاد آئیں کہ عورتیں ایسے ناکام مردوں کو ہجڑا کہتی ہیں۔ ایسے کمزور مردوں کو ہجڑوں کے سردار اپنے ساتھ اٹھالے جاتے ہیں۔ ایسے ہی مرد محلوں میں اور نوابوں کی کوٹھیوں میں زنان خانے اور مردانے میں پیامبر کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ اور ایسے ہی لوگوں کو شاہد باز اپنا معشوق بنا کر رکھتے ہیں۔ ان کی شادیاں نہیں ہوتیں اور اگر ہو بھی جائے تو عورت بہت جلد کسی ہٹّے کٹّے توانا و تندرست مرد کے ہمراہ نکل بھاگتی ہے یا بات بات پر تالی پیٹ کر اسے کوستی کاٹتی رہتی ہے۔ یہ تمام خیالات اس کے ذہن پر کھڈّی کی نجاست کی طرح گرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اِس فضلے میں حلق تک ڈوب گیا۔

وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر آ گیا۔ کتّا بدستور بھونکے جا رہا تھا۔

بھو... بھو... بھو...

اس نے دیکھا کہ کتے کا ایک پلا ٹاٹ کے ٹکڑے سے الجھ رہا ہے... اور بھونکے جا رہا ہے۔

چند ہی لمحوں میں گھڑی کی نجاست اس پر بکھر گرنے لگی۔

اپنے دوستوں کی تمام باتیں اسے یاد آنے لگیں۔

پھر اسے محسوس ہوا کہ دوستوں نے اُس کے عضوِ خاص کو ایک لمبے بانس میں اٹکا کر جلوس نکالا ہے اور سب کے سب سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ بھو... بھو... کی آواز پر اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔

وہ کتا ٹاٹ کے ٹکڑے سے الجھ الجھ کر بھونک رہا تھا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ نرم نرم لجلجے اور گرم گرم کتے کے پلوں کی لاشیں اس پر آہستہ آہستہ گر رہی ہیں۔

وہ اس احساس سے تھر تھرا اٹھا۔

اُس نے اس فاسد مادہ میں اُلجھے رہنے کی سی کیفیت سے اپنے آپ کو تیزی سے نکالنے کی خاطر اس پلے کو ٹاٹ سمیت اٹھالیا۔

وہ پلا اب بلند آواز میں بھونکنے لگا تھا۔

اس مکروہ آواز کی تاب نہ لاکر اس نے اسے سامنے کی دیوار پر پٹخ دیا۔

ریں... ریں... کی چند کراہوں کے بعد اُس پلے نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا سر پھٹ چکا ہے اور مغز بہہ کر باہر آگیا ہے تو اسے ایک نامعلوم سی لذت محسوس ہوئی، پھر بڑی تسکین!

نہ تو کھُڈّی کی غلاظت اس پر برس رہی تھی۔

اور نہ مرے ہوئے
کتّے کے پلّوں کی لاشیں اس پر گر رہی تھیں۔
پروہت نے کہنا شروع کیا:

"لوگو! آج ہماری بستی میں پرائی ریاست کا ایک نامرد آیا ہے۔ نامردی کے اس مرض کو دور کرنے کے لئے اس بستی کے عوام اسے ہمارے پاس چھوڑ گئے ہیں۔

اس مریض کا یہ مرض نیا نہیں ہے بلکہ پرانا ہے۔ صدیوں پرانا۔

اس کا علاج دو طریقوں سے کیا جائے گا۔

پہلے طریقہ، علاج میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔

اگر پہلا طریقہ، علاج کامیاب نہ ہو سکا تو پھر دوسرا طریقہ اپناؤں گا، اس صورت میں مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہوگی، سوائے اس کے۔"

پروہت نے انگلی اُٹھائی اور مرتبان میں کسمساتے، پہلو بدلتے، بچھو کی طرف موڑ دی۔

"اپنے ......

پہلے طریقہ، علاج کے مطابق میں آپ لوگوں سے درخواست کروں گا کہ آپ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ آگے بڑھیں۔ جب اس کے روبرو ہو جائیں تو اس کے سامنے رکھے ہوئے چوکور پتھر پر کھڑے ہوں اور پھر اس کے منہ پر تھوک کر، یا اس کے جسم پر موت کر یا اس کے چوتڑوں پر لاتیں مار مار کر اس کے جسم سے یا اس کے ذہن سے وہ کمزوری دور کریں، جو اُسے کوڑیالے ناگ کی طرح زہریلا بنائے ہوئے ہے۔

انہوں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔

آخ تھو... تھو... تھو... تھو... آخ تھو...

اُس کا چہرہ ان کے تھوک سے پُٹ گیا۔

بدبودار، غلیظ، متعفن تھوک۔ لیس دار، چکنا، بلغم آمیز تھوک۔

پھر سرسرسر... سرسرسر... پیشاب کی نالیاں کُھل گئیں۔

اُس کی گردن پر سے اترتا پیشاب۔

اُس کے حلق میں داخل ہوتا پیشاب۔

گلے اور پیٹ سے نیچے بہتا پیشاب۔

اُس کے عضوِ خاص کو نم کرتا پیشاب۔

اُس کی جانگوں اور رانوں پر سے بہتا ہوا پیشاب۔

پھر لاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

پھت... پھت... پھت،

وہ گر پڑا۔ اسے پھر کھڑا کیا گیا۔

اسے پھر لاتیں ماری گئیں۔

چوتڑوں پر لاتیں، کمر پر لاتیں، پیٹھ پر لاتیں، سر پر لاتیں۔

وہ اِس اذیت کی تاب نہ لاسکا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ پہاڑوں پر شفق پھیل چکی تھی۔ دور کوئی گڈریا اپنی بھٹکی ہوئی بھیڑ کو آواز دے کر بلا رہا تھا۔

جھونپڑے میں عُود و لوبان کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

اُس نے کروٹ لی۔

پھولوں کی سیج پر پھولوں کی مالا پہنے وہی سڈول اور بالا قد لڑکی نیم دراز تھی۔ ہاتھ میں اس کے چنبیلی کے پھولوں کا ہار تھا۔ وہ اُس نے اُس کے گلے میں ڈال دیا۔

اس کی آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت تھی۔ سینے میں مرمریں گنبد جیسا اُبھار کمر میں صراحی کا خم، کولہے ریشم کے گاؤ تکیے! اور رانیں دودھ کی نہریں!

گلاب کی پنکھڑیاں کھُلیں،

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

سارا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ تھوک، پیشاب، لاتیں، شور، مکھیاں بھنبھناہٹ ....

"مَیں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ تم کون ہو؟"

"آپ ہماری ہی بستی میں ہیں۔ یہ بستی آپ کی ریاست سے بہت دور ہے۔ میں... میں آپ کی داسی ہوں۔ اور پروہت کے حکم سے آپ کی سیوا میں بھیجی گئی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی شرم گاہ پر رکھا پھولوں کا گلدستہ اُٹھالیا۔

صاف و شفاف، سنہری و چمکدار، ہیرے کی کنی اس کے سامنے آگئی۔

دوسرے روز اس پروہت نے اسی مجمع سے کہا:

"آپ نے میرے پہلے طریقہ علاج میں میری مدد فرمائی۔ اس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

لیکن افسوس، صد افسوس... یہ نامراد اس علاج سے بھی اچھا نہ ہوا ___ نامردی کی مایوسی نے اسے اُس منزل تک پہنچا دیا ہے کہ یہ خون کر دینے سے بھی نہیں

ہچکچاتا۔ کل رات اِس نے ماں سرور کو قتل کر دیا۔"

یہ کہہ کر پروہت نے کچھ فاصلے پر کھڑے لوگوں کو اشارہ کیا، وہ آہستہ قدموں سے پروہت کی طرف بڑھے۔

اُن کے شانوں پر ایک جنازہ تھا۔ وہ پھولوں کی سیج پر اسی طرح لیٹی ہوئی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ صرف اس کے حلق میں ایک سوراخ کا اضافہ ہوا تھا۔

"میں مجبور ہوں کہ اپنے دوسرے طریقۂ علاج پر عمل کروں۔"

یہ کہہ کر پروہت نے پھر چند لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھے۔ انہوں نے اُسے پہلے سر سے، پھر سینے سے، پھر کمر سے ننگا کیا۔ جوں جوں اسے ننگا کیا جا رہا تھا توں توں اس کی گردن میں رعشہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے وہ نہیں نہیں کئے جا رہا ہو۔

ڈھول پیٹے جانے لگے۔ تاشے بجائے جانے لگے، گیت ایک لہر بن کر فضا میں لہرانے لگا۔ مکھیوں کی بھِن بھناہٹ تیز ہوتی گئی۔ کتّے کی غرّاہٹ بڑھ گئی۔

بھو، بھو، بھو،

دوستوں کی باتیں اس کے وجود پر کھڑی کی نجاست بن کر گرنے لگیں۔

پھر مردہ پتّے آسمان سے اس کے سر پر ٹپکنے لگے۔

اُس کے جبڑے تن گئے! اور منہ سے کف جاری ہو گیا۔

پروہت نے وہ مرتبان اپنے پاس سے ہٹا کر اس کے قریب رکھ دیا۔ بچھو اپنے ڈنک کو لہرا لہرا کر مرتبان کی چکنی دیواروں پر پٹخ رہا تھا۔

"لوگو! اس نامرد کی بیماری جو کہ سماج کے لئے انتہائی مہلک اور اِس

ریاست کے لئے قابلِ تشویش حد تک زہرناک ثابت ہوئی ہے۔ آپ کے اور میرے لئے ایک چیلنج ہے۔ میں اپنی وِدّیا اور انو بھو کے مطابق اس کا آخری علاج کرنے جا رہا ہوں، اگر اس میں سپھل نہ ہو سکا تو سمجھوں گا کہ میں ان بھگیہ ہوں اور اس روگی کا جیون کٹھور ہے۔"

لوگ زور زور سے ڈھول اور تاشے بجانے لگے۔ شور بڑھنے لگا۔ گیت کے بول اور مکھیوں کی بِھن بھناہٹ تیز ہو گئی۔

پروہت نے مرتبان کا ڈھکن کھول دیا۔

شور اچانک بڑھا اور کان میں بموں کی طرح پھٹنے لگا۔

پروہت نے بہ آوازِ بلند کہا۔

"خاموش"

اور پھر یک بہ یک سارے میں سناٹا چھا گیا۔

پروہت کی آواز فضا میں تیر گئی۔

"یہ عقرب چٹان پر ڈنک مارے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، سمندر میں پھونکے تو اِس کونے سے اُس کونے تک مچھلیوں کی لاشیں تیرتی نظر آئیں۔ بھوبن کو چھیڑے تو آگ بھڑک اُٹھے۔ سارا جنگل راکھ ہو جائے۔

یہ تمہاری نامردی کا زہر اپنے زہر سے کاٹے گا اور تمہیں نیا جیون عطا کرے گا۔

اوم تت ست۔"

اِس واقعے سے چند روز قبل حسبِ معمول وہ اپنے کمرے میں مُردے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ننگا، مادر زاد اور شہوت زدہ جاپانی عورتوں کی عریاں تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان کی رانوں میں اپنا سر رکھ دے اور ان کی شرم گاہ پر اپنی

زبان! اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اُن کے گداز اور کشادہ سینوں کو اپنی مٹھی میں لے کر اتنا کسے اتنا کسے کہ ان سے خون جاری ہو جائے۔ لیکن حسب معمول اس کے جسم کا ایک عضو بے حرکت اور بے جان پڑا تھا۔ بالکل لجلجے مینڈک کی طرح! کائی میں پڑے ٹھنڈے کیچوے کی طرح! اس نے پلیٹ میں رکھے انگور کے خوشے کو منہ سے لگایا، اور پھر وہی شہوت زدہ جاپانی عورتوں کی عریاں تصویریں دیکھنے لگا۔ اب اسے اپنے تن کے اس نافرمان عضو کی نافرمانی پر پہلے جیسی جھنجھلاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ اب اسے اس کی حکم عدولی اور ناسپاسی پر ویسا غصہ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ تو اب اپنی جھنجھلاہٹ، اپنی بے زارگی، اپنی ناکامی، اپنی محرومی اور اپنی کمزوری کے جذبے کی نکاسی کرنا سیکھ گیا تھا۔

اُسے جانداروں کو دیواروں پر پٹخ کر اور پھر اُن کا سر پاش پاش کر کے لذت ملتی تھی۔ لیکن عوام کو جوں ہی اس حقیقت کا علم ہوا انہوں نے اس کے علاج کی یہ تدبیر نکالی ــــ

مرتبان سے نکل کر بچھو اس کے عضو خاص کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کے خلیوں سے نکلے ہوئے پسینے کی بدبو بچھو کی قوت شامہ سے ٹکرائی۔

کس قدر غلیظ بو تھی وہ!

وہ بپھر گیا۔ اُس نے پوری قوت سے اپنا ڈنک پیچھے کھینچا اور پھر ڈنک بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا،

ڈنک کمان سے نکلے تیر کی طرح اس کے خُصیوں کے عین بیچ میں پڑا، پچ کی آواز ہوئی، خصیے کٹے اور نیچے گر کر خلا میں ڈوب گئے۔ خون کی پتلی سی لکیر بڑی دور تک ان کا تعاقب کرتی رہی۔

اگلے روز جب اُس ریاست کے عوام لاکھوں کی تعداد میں اپنے حکمران کو لینے آئے، تو انہوں نے دیکھا کہ اب ان کا حکمران بڑا تندرست توانا اور خوش نظر آرہا تھا۔

وہ سبھوں سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر ملا، پھر اس نے ان سب کا باری باری شکریہ ادا کیا، اور بڑی رقّت آمیز آواز میں اپنی بیماری، اپنی کمزوری اور اپنی نا اہلی کی اُن سے معافی طلب کی۔

وہ اسے اپنے سروں پر بٹھائے اپنی ریاست کو لوٹ گئے۔

کچھ عرصے کے بعد اس بستی میں خبر پہنچی کہ وہ حکمران بدستور اُسی مرض میں مبتلا ہے اور جانداروں کا سر دیوار پر پٹخنے کا عمل اس نے قدرے تیز کر دیا ہے!!

طلسم آباد

جب میں ٹرین سے اُترا تو اسٹیشن ویران تھا۔ اسٹیشن کی وسیع عمارت سے جب میں باہر آیا تو باہر بھی ویرانہ تھا۔ بس ایک آدمی کچھ فاصلے پر سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس ہاتھ میں چھڑی لئے کھڑا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے چھڑی کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں دھیمی رفتار سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر سیاہ ٹوپی ہے۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہے اور اس نے اپنے ہاتھ سیاہ دستانوں میں چھپا رکھے ہیں۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بوٹ کا رنگ بھی سیاہ ہے۔

اس نے اشارہ سے پوچھا۔ "پاس ؟"

میں نے اپنی ریاست کا عطا کردہ پاس جیب سے نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جانچنے کے بعد اُس نے وہ پاس مجھے لوٹا دیا۔ ضابطے کی اس کارروائی سے اسے کچھ اطمینان ہوا۔ چہرے پر سے اس کے وہ تناؤ جاتا رہا جو میں نے اس کے مزاج سے منسوب کر دیا تھا۔

وہ پلٹا اور چھڑی کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ وہ آگے

آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کچھ دور کی مسافت کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ عمارت اس ویرانہ میں اچانک نمودار ہوگئی ہے۔ سیاہ پوش اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اُس نے مجھے اشارے ہی سے ہدایت کی کہ میں اپنی جگہ پر رکا رہوں۔ وہ خود عمارت کے آہنی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی وہ دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔ جوں ہی یہ اندر داخل ہوا، وہ دروازہ جس آہستگی سے کھلا تھا اسی آہستگی سے پھر بند ہوگیا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سارے میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کے ٹھنٹھ، دور تک پھیلی ہوئی چٹیل زمین، بے ترتیبی سے اُگی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں، ان کو جھلساتی ہوئی تپش، گرم ہوا منھ پر خاک اڑا رہی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جیب سے رومال نکالا لیکن ابھی میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے ہی والا تھا کہ مجھے عمارت کے عقب سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ ٹاپ بہ تدریج بڑھنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک سیاہ بگھی کی کوچوانی کر رہا ہے۔ بگھی کا پچھلا حصہ کھلا ہوا ہے جس میں ایک بہت بڑا تابوت رکھا ہوا ہے۔ اس نے چابک لہرا کر مجھے بگھی کے پچھلے حصے میں ایک اسٹول پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں نے بلا چوں و چرا اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ روانگی سے قبل میری ریاست نے مجھے یہی تاکید کی تھی۔

بگھی شہر کی مرکزی شاہراہ سے گزرنے لگی۔ عمارتیں کھلی ہو چکی تھیں کھڑکیوں پر چیتھڑے اور دروازوں پر ٹاٹ جھول رہے تھے۔ دکانوں کے پٹ بند تھے مگر محسوس ہوتا تھا کہ اندر لین دین ہو رہا ہے۔ کارخانوں پر تالے پڑے تھے، لیکن ان میں سے ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک کی آواز آتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بستی کے

باسیوں نے اپنی روحیں وہیں چھوڑ دی ہیں فقط اپنے جسم لے کر اس بستی سے ہجرت کر گئے ہیں۔

بستی کے چوک میں پہنچ کر اس نے بگھی روک دی۔ وہ نیچے اُترا۔ میں نے اس کی پیروی کی۔ اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ آسمان تانبے کی طرح تپ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ آسمانی کیفیت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ پھر اس نے بگھی کھول دی اور گھوڑے کو چارہ دینے میں مصروف ہوگیا۔

مجھے سیاحی پسند ہے اور بستی بستی، قریہ قریہ گھومنے اور وہاں کے اسرار اور رسوم و رواج معلوم کرنے کا مجھے شوق ہے۔ آپ کی دل بستگی کی خاطر میں یہاں دو ایک قصبوں کی روایات نقل کرتا ہوں۔

کوڑھیوں کی ایک دور آباد بستی میں مجھے کوڑھیوں نے سانپ سے ڈسوایا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھے ضرر پہنچانا چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ میں ان کے ٹھنٹھ ہاتھوں سے مصافحہ کر سکوں۔ کوڑھی عورتوں سے محبت کر سکوں ـــــــ ان کی ناکوں کے خلا میں جھانکوں ـــــــ ان کے بچّوں کے ٹنڈ منڈ پیروں کو گُدگُداؤں تو مجھ سے کوڑھ کے جراثیم نہ چمٹ جائیں۔

اذیّت کے بعد لذّت۔

لذت میں پنہاں اذیت۔

ایک قصبے کے مردوں کو اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے جنسی اختلاط کی اجازت تھی۔ وہ جب بھی اپنے اٹھتے فوراً دری بچھا دیتے اور کتوں کی نقابیں اپنے چہروں پر چڑھا کر، گھر میں آواز دیتے، جو بھی آجاتا، یہ اسے دری پر لٹا دیتے اور مصروفِ عمل ہو جاتے۔

ایک گاؤں کی رسم تھی کہ ہر اُس شخص کا عضوِ تناسل کاٹ لو جو آپ سے بغل گیر ہو جائے ــــ پھر اس لوتھڑے سے رستا ہوا خون اپنے چہرے پر مل لیا کرتے تھے۔

لیکن اس شہر کا سب ہی کچھ نرالا تھا، نہ تو شہری تھے، نہ جانور، نہ پرندے تھے، نہ پھول نہ ہوا تھی، نہ تھا پانی۔ بس تھا تو وہ سیاہ پوش تھا جو گھنٹہ بھر سے مجھے چھڑی کے اشاروں پر نچائے جا رہا تھا، میں نے سوچا.... آخر یہ کیسا کھڑاگ ہے؟ یہ سیاہ پوش کون ہے؟ اس غیر آباد مقام پر کیا وہ تنہا رہتا ہے؟ اور یہ تابوت؟

اس میں کس کی لاش ہے، کسی کو قتل تو نہیں کر دیا اس نے؟ کہیں میرا انجام بھی... یہ خیال آتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا۔

سیاہ پوش نے ہاتھ جھٹکے۔ انگلیوں سے چپکی ہوئی گھاس کی پتیوں کو الگ کیا۔ کوٹ میں چین سے بندھی جیبی گھڑی نکالی، وقت دیکھا۔ آسمان پر دوبارہ نظر ڈالی اور وقت کا صحیح تعین کر چکنے کے بعد وہ تابوت کے قریب آیا۔ بڑی احتیاط سے اس کا منھ ذرا سا کھولا۔ اس کا ہاتھ تابوت کے بل میں سانپ کی طرح رینگ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کا ہاتھ تابوت کے اندھیرے میں رینگ رینگ کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ ہاتھ دھیرے سے پھر باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں چوزے کی سائز کا ایک گدھ تھا۔ چھوٹا سا نرم نرم، بھورا بھورا۔ سیاہ پوش نے اس کا رخ سورج کی طرف کر دیا۔ اور گردن اٹھا کر اپنی نگاہیں سورج پر گاڑ دیں اور لگا سہلانے اس گدھ کو ــــ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گدھ اپنے سائز میں بڑھنے لگا۔ پہلے تو وہ مرغ کی جسامت کو پہنچا اور پھر شتر مرغ کے برابر کا ہو گیا۔ سیاہ پوش نے اپنی جیب سے ایک چھلّا نکالا اور اسے گدھ کے بائیں پیر میں پہنا دیا۔ چھلّے کی کرامت تھی یا گدھ کی ذات کی تھیں۔

وہ بے چینی سے اپنے پر پھڑپھڑانے لگا۔ سیاہ پوش نے چند کلمات کا وِرد کیا اور اپنے ہاتھ کو سر سے بلند کر کے گدھ کو پرواز پر روانہ کر دیا۔ ——— گدھ اپنے پر پھڑ پھڑاتا اُڑا اور ہمارے سروں پر چکرانے لگا۔ ہر چکر پر وہ اونچا اٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے پھر چوزہ سا نظر آنے لگا۔ سیاہ پوش نے اپنے کوٹ کی جیب سے مٹھی بھر کالے مونگ نکالے۔ ان پر دم کیا اور وہ مونگ گدھ کی سمت ہوا میں اچھال دیے۔ پھر کیا تھا تمام آسمان گِدھوں سے ڈھک گیا۔

میں نے سوچا معاملہ گمبھیر ہے۔ اس قدر گمبھیر کہ اندازہ کرنا مشکل ہے۔ میں نے سیاہ پوش کی طرف قدرے احترام سے دیکھا۔ اس کی اَدھ ڈھکی پیشانی پر بل تھے اور ادھ چھپی آنکھوں میں تفکر۔ اس نے تابوت پھر کھولا۔ اب اسے اپنی مطلوبہ شئے کھوجنے میں دقّت نہ ہوئی۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو وہ ایک سوّر کو تھامے ہوئے تھا۔ سیاہ پوش نے سرخ و سفید سوّر کے منھ پر بوسہ دیا۔ بوسے کی لذت سے سرشار ہو کر سوّر نے آنکھیں بند کر لیں۔ سیاہ پوش نے اُسے ہولے سے زمین پر رکھا اور اس کی پشت سہلانے لگا۔ سوّر نے گویا دردِ زہ سے نجات پا جانے کی سی مسرت انگیز چیخ ماری اور آگے دوڑ گیا۔ اب وہاں اس سوّر کے بے شمار بچے کِل کِلا رہے تھے سیاہ پوش نے ان کے سروں پر اپنی چھڑی کو ایک دائرے میں حرکت دی۔ وہ اپنی تھوتھنیاں اُٹھائے سورج کو تکنے لگے۔ جوں جوں چھڑی دائرے بناتی گئی توں توں ان کی جسامت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کے قد کو پہنچ گئے۔ سیاہ پوش نے انہیں ایک سمت میں ہانک دیا۔ وہ اپنی پشتیں مٹکاتے دوڑ گئے۔

میں سوچنے لگا۔

گدھوں سے سوروں کو کیا نسبت ہو سکتی ہے؟

یہ مردہ خور پرندہ ہے۔ بدہیئت بھی ہے۔ سوّر فضلے اور کوڑے پر پلتا ہے اور یہ بھی کریہہ صورت جانور ہے۔ لیکن ان دونوں کا اس سیاہ پوش سے یا سیاہ پوش کا ان دونوں سے کیا تعلق ہے؟

ہزاروں گدھ ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ سورج کی تمازت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ میرے سر کا پسینہ گردن سے بہتا پشت پر، پشت سے بہتا کمر پر اور کمر سے بہتا جوتوں میں پہنچ رہا تھا اور زمین کی تپش سے خشک ہوا چلا جا رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ سے چڑ سی ہونے لگی۔

کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی؟

ایک مہمل سے کھیل کا مجبور تماشائی بننے کی!

پھر مجھے یاد آیا۔ اگر اُس روز میرا اُس ریستوران میں گزر نہ ہوتا اور وہ واقعہ نہ پیش آیا ہوتا۔۔۔ اور دم توڑنے سے پہلے مَیں اُس سے نہ ملا ہوتا تو شاید یہاں آنے کی نوبت نہ آئی ہوتی۔ اب تو وہ واقعہ کسی خواب کی طرح دھندلا دھندلا سا یاد رہ گیا ہے۔

اس نے روٹیاں ہوا میں اُچھالی تھیں۔۔۔ سالنوں کے قاب لوگوں پر انڈیلے تھے۔۔۔ شراب کے گلاس دیواروں پر پٹخے تھے۔ عورتوں کے زیوروں کو نوچا تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسموں کو اور برہنہ کیا تھا۔ مَردوں کی توندوں پر لاتیں ماری تھیں۔ اُن کے کپڑوں کو بھی تار تار کیا تھا اور لٹھوں کی مار سے ریستوران کی آرائشی

مصنوعات تباہ کر دی تھیں اور پھر۔۔۔

اس شہر کا نام چیخ چیخ کر لیتے ہوئے نوجوان نے اپنے کلیجے میں خنجر اتار لیا تھا۔

اپنے پر ظلم اور ستم ڈھانے والوں کے خلاف احتجاج ... مؤثر احتجاج ... میں نے سڑکوں پر پتھر کوٹنے والے انجن کے تلے دبی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔ زخموں اور ناسوروں پر بھنکتی مکھیوں سے لپی ہوئی بھوکوں اور ناداروں کی موتوں کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ سیلابوں کے اترنے کے بعد درختوں میں پھنسی ہوئی، اکڑی، ٹھٹھری اور پھولی ہوئی لاشیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ فلک بوس عمارتوں سے چھلانگ لگاتی ناآسودہ روحوں کا منظر میری آنکھوں میں تازہ ہے۔ پہاڑوں سے پھسل کر برف میں روپوش ہوئیں اور قبروں سے کھودی ہوئی لاشیں۔ گل و بلبل کو چھونے کی کوشش میں گنوائی گئی جانیں۔ سنگساری سے پارہ پارہ ہوئی لاشیں اور خودسوزی سے بھسم ہوئے جسم بھی میں نے دیکھے ہیں... جنہیں دیکھ کر جی متلانے لگتا تھا۔ اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی کنپٹیوں پر سلاخوں سے ضربیں لگا رہا ہو۔ لیکن اس نوجوان کی موت نے مجھ پر کوئی ایسا ناخوشگوار تاثر نہیں چھوڑا.. بلکہ اس نے یوں جان دے دی کہ جیسے کہہ گیا ہو مجھ سے۔

"یہ رہا سب کچھ ــــ"

میں اسی لمحے سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا... لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ میں اُس وقت تک اس شہر کا رخ نہیں کر سکتا تھا جب تک میری ریاست مجھے سفر کا پروانہ نہیں عطا کرتی۔

کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی؟

ایک مہمل سے کھیل کا مجبور تماشائی بننے کی؟

یہ سوالات میرے ذہن میں اسی طرح چکرا رہے تھے کہ جس طرح وہ گدھ سر پر منڈلا رہے تھے۔ لیکن اب میں اس نوجوان کی خودکشی، گلی میں غائب ہوئے سوروں اور اِن گدھوں کے تعلق کی درمیانی کڑی تلاش کر رہا تھا۔

اِن کے درمیان کوئی تعلّق تھا بھی یا نہیں؟

یا یہ میرا محض قیاس تھا؟

پھر... کسی بے تاب گدھ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ساتھ ہی کسی سوّر کی کراہ سنائی دی۔

سیاہ پوش نے پہلے آسمان کی اور اور پھر اس گلی کی اور دیکھا۔ اس کے گلے سے کتّے کی غرّاہٹ سنائی دی۔ ڈھکے ہوئے ہونٹ پھڑپھڑاتے۔ اس نے تابوت کا سرا پھر کھولا اور ایک ہاتھ بھر کا گُڈّا باہر نکالا۔ گڈّے کا لباس کرتے اور دھوتی پر مشتمل تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ۔ گڈّے کے منھ سے اپنا منھ جوڑ کر سیاہ پوش نے اپنا دم اس کے سینے میں منتقل کیا۔ گڈّے کے سینے میں زیر و بم پیدا ہوئے۔ گویا اس میں جان پڑ گئی ہو۔ اس نے یوں انگڑائی لی گویا لمبی نیند سے جاگا ہو۔ پھر وہ سورج کی طرف منھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ سیاہ پوش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ نا سمجھ میں آنے والے چند کلمات اس کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ آنِ واحد میں اس گڈّے کا سائز قدِ آدم کے برابر ہو گیا۔ اب میرے سامنے ادھیڑ عمر کا آدمی کاغذوں کا پلندہ لئے کھڑا تھا۔ سیاہ پوش نے اسے بھی اسی گلی میں ہانک دیا کہ جس گلی میں وہ سوّر داخل ہوئے تھے۔

میں حیرت سے اُسے کاغذوں کا پلندہ بغل میں دبائے گلی میں داخل ہوتا دیکھتا

رہا۔ سیاہ پوش نے جیب سے مٹھی بھر مونگ پھلی نکالے اور اس شخص پر اچھال دیے۔ میں نے دیکھا کہ اسی حلیے کے کئی لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اسی گلی میں جا کر روپوش ہو گئے۔

سیاہ پوش نے دوبارہ گھڑی جیب سے نکالی۔ ایک نظر اس پر ڈالی۔ تیزی سے مڑا اور اب کی مرتبہ تابوت کا ڈھکن اس نے پورے کا پورا کھول دیا۔ تابوت کافی گہرا تھا اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے مجھے اس کے اندر موجود عجوبات نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابھی میں قریب جا کر اس کے اندر جھانکنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سیاہ پوش کا ہاتھ اس میں سے برآمد ہوا۔۔۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔۔۔ غرض کہ یکے بعد دیگرے وہ کئی گڈے اور گڑیاں اس میں سے نکالتا چلا گیا۔ ایک اچٹتی نگاہ پھر گھڑی پر ڈالی اور وقت کی کمی کا شدید احساس اس کی حرکتوں سے عیاں ہو گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے ان گڈے گڑیوں کو ایک مناسب ترتیب میں لگانے لگے۔ دو ایک کا مقام اس نے غور کرنے کے بعد بدلا اور اب کی بار غور سے دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

ان کے رخ سورج ہی کی سمت تھے۔ وہ ان کی پشت پر کھڑا ہوا اور سورج پر نظریں گاڑ کر ان کے سروں پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے میری سمجھ میں نہ آنے والے انہیں کلمات کا ورد بھر کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان میں عملِ تنفس جاری ہو گیا۔ جسموں میں خفیف حرکتیں پیدا ہوئیں اور وہ اپنے قد و قامت میں بڑھنے لگے۔ گویا وہ ربر کے مجسمے ہوں۔ جن میں ہوا پمپ سے بھری جا رہی ہو۔ جب وہ قدِ آدم کو پہنچے تب اس نے اپنی دعا ختم کر دی۔ اس نے آخری مرتبہ ان کا جائزہ لیا۔

بارڈر سیکورٹی فورس کا جوان، پولس فورس کا جوان مجسٹریٹ تاجران، مذہبی لیڈران، بیسوائیں، کمہار، قصاب، تانگے والے، رکشے والے، باجے والے، ظروف ساز،

موچی، خاکروب، بوجھ ڈھونے والے، کھیت مزدور، بہشتی، بھکاری، مرد، عورتیں،
بچے... مرد، عورتیں، بچے... غرضیکہ اس تابوت میں سے پورے کا پورا شہر برآمد ہو گیا...
سیاہ پوش تمسخرانہ انداز میں مسکرایا... چھڑی گھمائی... اور ان سبھوں کو اس
نے اُسی گلی میں ہانک دیا۔ جیب سے کالے مونگ نکالے، اُن پر دم کیا اور اُنہیں ان پر
اُچھال دیا۔ اُن کی تعداد پلک جھپکتے میں کئی گنا ہو گئی۔ وہ ہولے ہولے چلتے گئے اور اس گلی
میں روپوش ہوتے گئے۔
سیاہ پوش نے ہاتھ جھٹکے۔ جیب سے سگریٹ نکالا اور لائٹر کی مدد سے
اُسے سلگا کر میرے قریب آیا۔
"بڑا بورینگ کام ہے۔"
"بورینگ؟..." میں نے حیرت ظاہر کی۔
"ہاں" وہ دھواں اُگلتا ہوا بولا "بڑا بورینگ... پہلی بات تو یہ ہے کہ
ہر روز یہ ڈرامہ کرنا پڑتا ہے... دوسری یہ کہ بات کرنے کی ممانعت ہے... تیسری یہ
کہ پردہ کی پابندی ہے۔"
"تو پھر... تم مجھ سے؟"
"ہاں... زبان ترس گئی تھی... اور اب پکڑے جانے کا امکان بھی نہیں...
اور یہ تابوت بھی خالی ہو چکا ہے... تمام چُغل خور جا چکے ہیں۔"
"لیکن تم یہ کام...؟"
"معاوضے پر کرتا ہوں۔ پہلے سڑکوں پر مجمع لگا کر لوگوں کا دل بہلاتا تھا۔ دس
پانچ کما لیا کرتا تھا۔ اب بھی سڑکوں پر مجمع لگاتا ہوں... لیکن ڈھنگ نرالا ہے۔ امپریشن

خوب پڑتا ہے ... پوزیشن بھی بن گئی ہے ... اب دیکھو نا اتنے بڑے شہر میں اکیلا ہی ہوں ... کبھی کبھار محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں اس شہر کا حاکم ہوں اور ... کبھی۔"

"لیکن تم یہاں کس کے لئے کام کرتے ہو؟ تمہارا معاوضہ کون ادا کرتا ہے؟"

"جس ٹرین سے تم اترے تھے اسی ٹرین کا گارڈ مجھے ہر ماہ دو ہزار روپے کا لفافہ دے جاتا ہے ... بھائی میں بھی بال بچے والا آدمی ہوں ... اس حُلیے میں تمہیں ضرور پُراسرار لگ رہا ہوں گا ... کیا کروں یہ میرا یونی فارم ہے ... لیکن میں ہرگز بُرا آدمی نہیں ہوں ... میرے بچے اسکول میں پڑھتے ہیں ... بیوی گھر گرہستی سنبھالتی ہے اور ہر سوموار کو مجھے پریم پتر بھی لکھتی ہے۔"

"کیا ... انہیں معلوم ہے کہ تم ... یہاں اس کام پر تعینات کئے گئے ہو ...؟" میں نے جھجک کر پوچھا ... گویا میں جان گیا تھا کہ وہ کوئی غیر شریفانہ یا غیر انسانی کام انجام دے رہا ہو۔

وہ سمجھ گیا۔

"جس کام کا معاوضہ مل جائے وہ کام ہرگز بُرا نہیں ... اور اگر بُرا ہے بھی تو مجھے اس سے کیا سروکار؟ جس کے اعمال بُرے، آخرت خراب ہو اُس کی۔ مجھے کیا پرواہ ... وہ جانے اور اس کے کام ..."

"لیکن وہ کون؟؟" میں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"شی ... شی ... شی ..." اُس نے اپنے لبوں پر انگلی رکھ دی۔

میں نے محسوس کیا کہ سورج کی تمازت اچانک بڑھ گئی ہے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے اوپر دیکھا۔ لیکن میں نظر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے اطراف کی مرئی اور غیر مرئی ... ہر ہر شے ہماری گفتگو پر کان دھرے بیٹھی ہے۔

ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی میرے جسم میں!

اُس نے پھر گھڑی دیکھی اور کہا۔

"تم چاہو تو اس ڈرامے کا بقیہ حصہ اسٹیج پر دیکھو ... یا چاہو تو ٹی، وی پر۔"

"ٹی، وی پر؟"

"ہاں!" اس نے تابوت کو کھولا۔ تابوت کے ڈھکن کی اندرونی ساخت فلم کی اسکرین جیسی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تم ہی بتاؤ۔"

"میرا خیال ہے کہ ٹی وی پر دیکھنا بہتر ہوگا کیونکہ تم جو کچھ بھی دیکھو گے، وہ حقیقت ہی ہوگی۔ لیکن ٹی وی اسے ہر حال میں آرٹی فی شل (مصنوعی) بنا دے گا۔ اِس لئے واقعہ کا اِم پیکٹ (اثر) بھی کم ہوگا۔

شہر میں رہتے رہتے اور زندگی کی حقیقتوں سے نظریں چراتے چراتے کتنے ہی دن بیت گئے تھے! اور مجھے اپنے خول میں پڑے رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ سست سی محفوظ حالت۔ ہر صبح اخبار میں خونریزی، غارت گری کے واقعات ... چوری، غنڈہ گردی، جعل سازی، اغوا اور زنا کاری کی خبریں ... جبر و تشدد، جنگ، ایٹمی خطرات کی اطلاعیں ... سمیت، گرد و غبار، بیماریوں اور وباؤں کی وارننگز۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیئے جانے اور شہر کے شہر تاخت و تاراج کر دیے جانے کے سانحے میں بلا ناغہ پڑھتا ... لیکن اپنے اطراف اپنے بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر یا اپنی بیوی کو رسوئی میں کھانا

پکاتے پاکر اور اپنی جیب میں شام کی دار و اور دوستوں کی تواضع پر خرچ ہونے والی رقم کا اندازہ کر کے مسرور ہو جاتا تھا۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ میں ان واقعات پر، ان خبروں پر، ان اطلاعوں پر، ان سانحوں پر حقیقت کا گمان کروں! میرے لئے تو یہ تمام غیر متعلق، بے گانی، لے مصرف اور تصنع آمیز باتیں تھیں جو میرے ذہن کے سانچے میں اتر ہی نہیں پاتی تھیں۔

پچھلے کئی دنوں سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا بارہ سالہ لڑکا اب لوگوں سے دبی آواز اور ملائم لہجے میں بات کرنے لگا ہے۔ اس نے مجھے محلّے کے داداؤں، سینما کے ٹکٹ بلیک کرنے والوں، مٹکا چلانے والوں، بھڑوؤں، سیٹھوں، صاحبوں پولس انسپکٹروں اور حوالداروں کو ادب سے سلام کرتے اور ان کے بال بچّوں کی خیر و عافیت پوچھتے بارہا دیکھا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے مینٹل نوٹس (MENTAL NOTES) لیتا رہا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ میرا باپ اس سوسائٹی کا بڑا کامیاب فرد ہے۔ ملنسار، ہنس مکھ، کلچرڈ اور سیولائزڈ (CIVILIZED)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ اس دور میں محفوظ اور آرام دہ زندگی گزارنے کے یہی گُر ہیں۔

سیاہ پوش نے میری اس طویل خاموشی کو اپنے فیصلے کی تائید سمجھا۔ پھر اس نے کونے میں بنے پینل کا بٹن آن کر دیا۔ اسکرین کا ٹیوب روشن ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد سیٹیاں بجنے لگیں۔ اب اسکرین پر نقوش اُبھرنے لگے۔ سیٹیاں رک گئیں۔

بہت بڑے میدان کا کرین شاٹ (CRANE SHOT) لیا جا رہا تھا۔ کیمرہ میدان میں کھڑے بے شمار لوگوں کے چہروں پر پین (PAN) ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً پہچان

لیا۔ یہ وہی لوگ تھے کہ جن کو سیاہ پوش نے گُڈّے گڈیوں سے انسانی پیکر عطا کیا۔ تھا۔ بیسوائیں، کمہار، قصاب، تانگے والے، رکشے والے، باجے والے، ظروف ساز، موچی، خاک روب، بوجھ ڈھونے والے، کھیت مزدور، بہشتی، بھکاری، مرد عورتیں اور بچے۔۔۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے منھ پر ٹیپ (TAPE) چپکا دیئے گئے تھے۔

"صفیں درست کر لو" لاؤڈ اسپیکر سے حکم صادر ہوا۔

وہ یوں بھی قطاروں میں کھڑے تھے۔ لیکن حکم سُن کر اس قدر ہیبت زدہ ہوئے کہ میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھگدڑ مچ گئی۔ وہ اپنے پنجوں کو آگے پیچھے سرکا کر اور اپنے شانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر صفیں درست کرنے لگے۔

اب کیمرہ ڈولی شاٹ (DOLLY SHOT) لے رہا تھا۔ اور قطاروں کے عمودی سمت میں چل رہا تھا۔ انہوں نے اب اپنی صفیں بالکل درست کر لی تھیں۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ ان کی پشت پر چمڑے کے فیتوں سے کسے ہوئے ہیں۔

شاٹ کٹ ہوا۔ اب کیمرہ بہت دور سے پلیٹ فارم پر فوکس ہوا۔ پلیٹ فارم پر چند پیکر دھندلے سے نظر آئے۔ اب ڈولی (DOLLY) پلیٹ فارم کی جانب بڑھنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ دھندلے پیکر واضح ہونے لگے۔

شاٹ فریز (FREEZE) کر دیا گیا۔

عین وسط میں رکھی اونچی مسند پر سوٹ بیٹھا ہوا تھا جو اپنے ایک ہاتھ

میں چھوٹا سا آئینہ تھامے ہوئے تھا! اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ابروؤں کو سنوار رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب بارڈر سیکورٹی فورس کا جوان، پولس فورس کا جوان اور انہی دو فورسیز کے دیگر جوان کھڑے تھے۔ سوّر کی بائیں جانب تاجران اور مذہبی لیڈران اور ان ہی دو طبقوں کے دیگر افراد کھڑے تھے۔ سوّر کی اولادیں اپنے بزرگ کی پشت پر کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے مسند کی پشت کو تھامے ہوئے تھے۔

مجسٹریٹ سوّر کے چرنوں میں اپنے مخصوص لباس اور اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا ہوا تھا جس کے بائیں جانب وہ ادھیڑ عمر کا آدمی کاغذوں کا پلندہ تھامے مودّب کھڑا تھا۔

کیمرہ اب ایریل ویو (ARIEL VIEW) پیش کر رہا تھا۔

انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، رنگ برنگی پنڈال اور پنڈال پر گیان دھیان میں بیٹھے ہوئے گدھ!

میں نے اسٹول سے اٹھ کر ٹی۔ وی آف کر دیا۔

"یہ کیا؟" سیاہ پوش نے قدرے برہمی سے کہا اور ٹی وی آن کر دیا۔

میں نے اپنا رخ پھیر لیا اور اپنی پیٹھ ٹی۔ وی کی جانب کر لی۔

"لاؤ سگریٹ پلاؤ"

اس نے سگریٹ اور لائٹر مجھے تھما دیا۔

"تمہیں یہ شو پورا دیکھنا ہوگا"

"کیوں۔؟ ... کیا یہ ضروری ہے؟"

"ہاں دستور تو یہی ہے۔"

"دستور ... کس کا دستور؟" میں نے بے تعلقی سے پوچھا۔

"اسی کا ... کہ جس کا یہ سیٹ اپ (SET - UP) ہے۔"

"لیکن میں یہ شو دیکھنے پر مجبور نہیں ... اور یہ شو میرے لئے کوئی نیا نہیں ... یہ تو آئے دن کی بات ہے ... کبھی کبھار اس سے بھی دلچسپ تماشے دیکھنے کو مل جاتے ہیں مجھے اپنی زندگی میں ... اور اخبار میں اس سے بھی ہولناک خبریں پڑھنے کو ..."

"تو ..." اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

"تو ..... کچھ نہیں ..... یہ گورکھ دھندہ چلتا ہے تو چلا کرے ..... مجھے اس میں ذرا سی بھی دلچسپی نظر نہیں آتی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو! تم نہیں جانتے اس کا انجام کتنا تاسف انگیز اور المناک ہے۔"

"وہ تو ان گدھوں کی آنکھوں میں چھائی ہوئی ویرانی سے ظاہر ہے .... اور ... اس ستور کے کولڈ بلڈیڈنیس (COLD BLOODEDNESS) سے۔"

میری نظروں میں ایک ہاتھ میں آئینہ اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ابروؤں کو سنوارتے اس ستور کی تصویر گھوم گئی۔

"غالباً یہ شو تم نے کہیں دیکھا ہو گا؟"

"نہیں۔"

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ مجھے دور بہت دور سے کسی کی سسکیاں سنائی دیں جیسے کوئی بین کر رہا ہو ... جیسے نوحہ پڑھا جا رہا ہو ....

بس اسی لمحے، اسی پل مجھے اس نوجوان کی، اس ریستوران میں عذر و احتجاج

کے طور پر کی گئی خودکشی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

بات کہنے کو یہی باقی رہ گئی ہے کہ ہم دونوں وقفے وقفے سے سگریٹ پھونکتے رہے اور شو کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ شام کو کھیل ختم ہوا۔ اس کے سارے کردار یکے بعد دیگرے واپس ہونے لگے ـــــ گدھ، سؤر، ادھیڑ عمر آدمی، بارڈر سیکورٹی فورس کا جوان ..... پولس فورس کا جوان ..... مجسٹریٹ ..... تاجران ..... مذہبی لیڈران ..... بیسوائیں ..... کمہار، قصاب، تانگے والے، رکشے والے، باجے والے، ظروف ساز، موچی، خاک روب، بوجھ ڈھونے والے، کھیت مزدور، بہشتی بھکاری، پورے کا پورا شہر۔ سیاہ پوش نے ان کے سروں پر اپنی چھڑی کو دائروں میں حرکت دی۔ وہ اپنی تعداد میں گھٹنے لگے۔ آخرکار ہر قسم اور ہر پیشے کا بس ایک ایک نمائندہ باقی رہ گیا۔ سیاہ پوش نے انہیں ترتیب وار کھڑا کیا۔ چند کلمات کا وِرد کیا اور جب اس نے ان پر دم کیا۔ وہ تمام آدم زاد پھر سے گڈّے اور گڑیوں میں تبدیل ہو گئے۔ پرندے اور جانور سمٹ اور سکڑ کر اپنے جُثّہ میں گھٹ گئے۔ سیاہ پوش نے انہیں فرداً فرداً تابوت میں اُتارا، پھر تابوت مقفل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے بگھی جوتی، بچا ہوا چارہ سمیٹ کر بگھی سے لٹکے جھولے میں ڈالا۔ ہتھیلیاں مل کر صاف کیں پھر جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے لگام سنبھالتے ہی بگھی چل پڑی ..... اور رات بھر ..... سنسان ویران راستوں پر چلتی رہی۔ میں اسٹول پر بیٹھا اونگھتا رہا۔

جب بگھی اسٹیشن کے قریب پہنچی، چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے اور وہی ٹرین دھواں اڑاتی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں تیزی سے بگھی سے اُترا۔ وہ

اپنی سیٹ سے کودا۔ اس نے اشارے سے پھر پاس طلب کیا۔ کوٹ کی اوپری جیب سے قلم نکالا۔ پاس پر کوئی اندراج کیا۔ اور وہ پاس اس نے مجھے لوٹا دیا۔ رخصتی سے پہلے کرٹسی (COURTESY) کے طور میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اپنے ہاتھ کے جھٹکے سے اس نے مجھے جھڑک دیا۔ اس کی ادھ ڈھکی آنکھوں میں بے مروتی در آئی تھی؛ اور چہرے پر شدید تناؤ کے آثار نمایاں ہو چکے تھے!!

گارڈ کی تیز سیٹی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اسی لمحے انجن بھی چیخا۔ میں گاڑی کی سمت تیزی سے دوڑا.... گاڑی رینگنے لگی.... میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اور گاڑی پکڑ لی ـــــــ میں دروازے میں کھڑا چھوٹتا منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ متحیر ہو گیا۔

ایک آدمی اسٹیشن کی وسیع عمارت سے باہر نکل رہا تھا جسے
دور کھڑا سیاہ پوش چھڑی کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا
تھا!!

چاند پر بھی سایہ ہے

فلومینا سمندر سے نمودار ہوئی اور ساحل پر پڑے کپڑوں کی جانب دونوں ہاتھوں سے اپنے رخساروں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میری آنکھوں میں سینکڑوں دائرے اور نیم دائرے بنتے چلے گئے۔ اُس نے تولیئے سے جسم خشک کیا، پھر وہ تولیہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر بیٹھ گئی، نرم ریت نے اُس کے جسم کی تمام قوسوں کو جوں کا توں قبول کر لیا۔ اُس نے بیگ میں سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ نومبر کا مہینہ تھا... ہندوستان کے اِس جنوبی مغربی ساحل پر ہوا دھیمے دھیمے بہہ رہی تھی۔ پس منظر میں ناریل کے درخت لہرا رہے تھے۔ دل کسی آبی پرندے کی طرح اُچھل کود رہا تھا۔

"صبح بخیر" میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا

اُس نے کوئی جواب نہ دیا، اپنی نظریں کتاب ہی پر جمائے رکھیں۔

میں نے اپنا بایاں ہاتھ اُس کے سامنے کر دیا۔

"اوہ نو" کتاب اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور اس نے میرے کلائی سے کہنیوں تک، بینڈیج میں لپٹے ہوئے ہاتھ کو، اپنے ہاتھوں میں لے کر سینے

سے لگا لیا۔ اُس میں سے اینٹی سپٹیک کریم اور اسپرٹ کی ملی جلی بُو اُٹھ رہی تھی۔

میں نے مسکرا کر پوچھا "کہاں ہے وہ؟"

فلومینا نے گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"یہیں کہیں ہوگا... وہ دیکھو..." اس نے انگلی کے اشارے سے ریت میں بنے ہوئے نشان کی طرف میری توجہ دلائی۔ "اُدھر گیا ہے۔"

میں نے دیکھا ریت میں دور تک بَل کھاتی ہوئی رسّی کا نشان بنتا چلا گیا تھا۔

"کہیں دور نکل گیا ہے" اُس کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ "آؤ دیکھیں"۔ وہ میری رضامندی کی پرواہ کیے بنا ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اُٹھنا پڑا۔ فلومینا سے میری یہ تیسری ملاقات تھی۔

پہلی ملاقات ہفتہ بھر قبل ہوئی تھی۔

وہ ساحل پر بنے ہوئے جھونپڑے میں بیٹھی ننگ دھڑنگ ہپیوں سے خوش گپیّاں کر رہی تھی اور میں 'میرامار' بیچ پر ٹہلتا ٹہلتا چائے پینے کی خاطر وہاں پہنچا تھا۔ جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی مَیں نے اخلاقاً سبھوں کو ہلو کہا۔ لیکن سوائے فلومینا کے کسی اور نے مجھے جواباً ہلو نہیں کہا۔ میں کونے میں رکھی ہوئی ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ چند لمحوں بعد ایک بارہ چودہ سالہ گووَن لڑکی میرا آرڈر لینے آئی۔ میں نے اُسے چائے کا آرڈر دیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور نرم ریت پر اپنے پیر دراز کر دیئے۔ ابھی میں سگریٹ سلگا کر جھونپڑے میں بیٹھے ہپیوں کا ٹھیک سے جائزہ بھی نہ لینے پایا تھا کہ مجھے اپنے پیروں کے پاس پھنکار سنائی دی۔ اضطراری طور پر ایک جھٹکے سے میں پیچھے کو ہٹا۔ بینچ ہلکی تھی لڑھک گئی۔ ساتھ میں میں بھی گرا۔ وہ میری

داہنی جانب رینگ آیا اور اپنا پھن کاڑھے میرے سر پر منڈلانے لگا۔ زندگی میں دو چار مرتبہ ہر کسی کو اپنی موت اپنی آنکھوں میں ناچتی نظر آتی ہے۔ میری زندگی میں وہ پہلا موقعہ تھا۔ فلومینا اٹھی، ہمارے قریب آئی پھر اس نے جھک کر اُسے گردن سے تھام لیا اور اسے اپنی گود میں اٹھائے وہ دوبارہ اسی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ ہپّی کہ جو اس کے قُرب اور لمس کا لطف لے رہے تھے اب اس سے دور کھسکنے لگے تھے۔ میں اپنا سر سہلاتا کہ جو میرے پیچھے پڑی ہوئی بینچ سے ٹکرایا تھا۔ اُٹھا اور جس راہ سے آیا تھا اسی راہ پر واپس ہوا۔ اُس واقعے نے میری سٹّی گم کر دی تھی۔ سیر کا لطف جاتا رہا تھا۔ میں یہ بھی بھول چکا تھا کہ میں نے ابھی ابھی چائے کا آرڈر دیا تھا۔

میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ کسی کی مترنم آواز آئی۔

"موسیو..... موسیو۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا فلومینا تیزی سے میری جانب چلی آ رہی تھی۔ ابنِ صفی کے کسی ناول میں میں نے یہ لفظ اپنے سنِ بلوغت میں پڑھا تھا! اور اب چالیس برس کی عمر میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو کسی اور کی زبان سے 'موسیو' کہہ کر مخاطب کرتا پا رہا تھا۔

ورنہ مسٹر کہہ کر ہزاروں نے مجھے اپنی سوسائٹی میں بڑا شرف بخشا تھا اور مسٹر ہی کہہ کر وہ مجھے متعدد بار ذلیل بھی کر چکے تھے۔

میں تھم گیا۔ وہ لہراتی ہوئی قریب آنے لگی۔ اس کا جسم ہر ہر قدم پر دائرے اور نیم دائرے بنا رہا تھا۔

"میں شرمندہ ہوں... بے حد شرمندہ۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے سمندر کی لہریں اُترنے لگیں۔

"لیکن... لیکن اُس واقعے سے..." میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

یہ میرا پالتو ہے۔ میں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ دیر کے لئے غافل ہو گئی تھی۔ اور نتیجے میں یہ واقعہ پیش آیا۔

اب بات واضح ہو چکی تھی۔ وہ میرے سامنے نظریں نیچی کئے اپنے بائیں انگوٹھے کا ناخن دانتوں سے کترتی یوں کھڑی تھی۔ گویا کوئی بچی اپنے کلاس ٹیچر کے سامنے پشیمان ہو۔

"دیٹ از آل رائٹ.. پلیز ڈونٹ بادر۔" میں نے تسلّی آمیز لہجہ میں کہا۔

"تھینک یو موسیو... تھینک یو۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی۔ میں اُس کی خوش اخلاقی، اُس کی دردمندی، اُس کی پشیمانی، اُس کی نرم گفتاری کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں کی بے قراری اور اُس کے جسم کے دائروں اور نیم دائروں کے خیال میں ایسا کھویا کہ مجھ کو اس بیچ سے اپنے ہوٹل تک کی طویل مسافت کا کوئی احساس ہی نہ رہا۔ میں چلتا رہا، چلتا رہا۔ رات جب میں اپنے بستر پر لیٹا صاف اور شفاف آسمان پر چاند کو تک رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ فلومینا بڑی دور سے چاندنی میں تیرتی ہوئی میری جانب چلی آ رہی ہے اور اُس کے بل کھاتے، لہراتے جسم سے ہزاروں دائرے اور نیم دائرے بنتے چلے جا رہے ہیں۔ میں بچوں کی طرح اُچھل اُچھل کر انہیں اپنی مٹھی میں پکڑنا چاہتا ہوں اور وہ ہیں کہ میرے ہاتھ سے پھسل پھسل جاتے ہیں۔

دو روز بعد پنجم کے پوسٹ آفس سے اپنے اخبار کے دفتر کو جو بمبئی میں واقع تھا، گوا کی مقامی خبریں ٹیلی گراف کروا کر میں باہر نکل رہا تھا کہ وہ مجھے پوسٹ آفس کے دوسرے سرے سے باہر نکلتی نظر آئی۔ اُس کے جسم سے نکلتے دائروں اور نیم دائروں نے مجھے پھر گدگدانا شروع کر دیا۔ میں نے تیز قدموں سے اُسے جالیا۔

"ہائے موسیو... تم سے دوبارہ مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔" اُس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"اور مجھے بھی۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا گلابی ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"کیا خیال ہے ایک ڈرنک ہو جائے۔" میں نے پیش کش کی۔

"اوہ... آئی ڈونٹ مائنڈ۔" اس نے خوشی سے آفر قبول کر لی۔

ہم مانڈوی ندی سے لگے پرتگالی طرز پر بنے ایک چھوٹے سے بار کی جانب چل پڑے۔ اُس نے مہین کپڑے کا پھول دار سایہ پہن رکھا تھا اور اس کے شانوں سے ایک ایئر بیگ جھول رہا تھا۔ بار میں پہنچ کر ہم نے ایک کونے کی میز منتخب کی کہ جس کا رُخ مانڈوی کی جانب تھا۔ آرڈر کے مطابق بارمین جملیٹ لے آیا۔ ہم ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔ وہ مسکرا مسکرا کر موتی بکھیرتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی آنکھوں میں ابر سے ڈھکے ہوئے سورج کی نمائش بھی کرتی رہی۔

جگ بیتی سنتے سناتے، میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں میں اس قدر ذہنی مطابقت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی باتیں موسیقی کی طرح سن رہے ہیں۔ ایک پیشہ ور جرنلسٹ ہونے کے ناطے اور اپنے مخاطب سے کرید کرید کر سوال کرنے کی عادت سے مجبور ہو کر میں نے کچھ اس بے تکلفانہ انداز میں اس کے ماضی کے متعلق دریافت

کیا کہ اس نے اپنی ۔ ۔ ۔ زندگی کھُلی کتاب کی طرح میرے سامنے رکھ دی ۔

فلومینا اینگلو انڈین تھی ۔ اُس کا باپ انگریز تھا اور گوا میں پرتگالیوں کو فوجی تعلیم دینے کی خدمت پر مامور تھا ۔ اس کا نام ہنری جیمز تھا ۔ فلومینا کی ماں کہ جس کا نام 'میری' تھا بڑی حسین اور نازک بدن خاتون تھی ۔ وہ کانوینٹ کی پڑھی لکھی تھی ۔ گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر میری اپنے گھر سے لگی شراب کی دکان سنبھالا کرتی تھی ۔ اس روز اتوار تھا ۔ جیمز سینٹ زیویئر چرچ سے عبادت کر کے نکلا تھا اور ٹہلتا ٹہلتا فیری سے قریب واقع اِس بار کی طرف آنکلا تھا ۔ جس وقت جیمز اس شراب خانے میں پہنچا میری کاؤنٹر پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی ۔ جیمز نے فینی خریدی اور ایک کونے میں بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا ۔ گراموفون پر کوئی پرتگالی گیت بج رہا تھا ۔ تیسرے پیگ کے خاتمے پر جیمز بے تاب ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دراصل جیمز کو یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی گوون لڑکی اتنے اِشتیاق سے انگریزی ناول پڑھ سکتی ہے ۔ جیمز نے اپنا شبہ رفع کرنے کی خاطر چند سوالات اس ناول سے متعلق میری سے کر دیئے ۔ میری نے ڈرتے جھجکتے ، لیکن درست انگریزی میں ناول کے پلاٹ اور اس کے کرداروں سے متعلق جیمز کو جب کئی باتیں بتائیں تو جیمز کے دل میں میری کی عزت پیدا ہوئی ۔ پھر جیمز میری میں دلچسپی لینے لگا اور اُسے اپنے بیرکیس کی لائبریری سے ناولیں لا لا کر دینے لگا ۔ جیمز بذاتِ خود مطالعہ کا شوقین اور سیر و تفریح کا رسیا تھا ۔ اس کے باوجود نیک چلن اور شریف آدمی تھا ۔ اس نے میری کے والد مسٹر گنسالویز سے ان کی لڑکی کا ہاتھ مانگا ۔ مسٹر گنسالویز ، جیمز کو اپنے کوٹ پر تازہ گلاب آویزاں کئے ، اپنی دکان پر بلا ناغہ آتے جاتے دیکھ چکے تھے ۔ انہوں نے اپنی بیٹی اور چند رشتے داروں سے رسمی پوچھ تاچھ کرنے کے بعد اُن دونوں کی شادی کر دی ۔

ٹھیک دسویں مہینے میں فلومینا پیدا ہوئی۔

فلومینا کے ذہن پر اُس کے نانا کی مذہبیت سوار رہی جس کی وجہ سے اس کی سوچ و فکر کی فطری نمو بری طرح متاثر ہوئی۔ مسٹر گنسا لویز بڑے متقی اور پرہیزگار آدمی تھے اور حضرت عیسےٰ سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ اُن کے شوقِ عبادت کا یہ عالم تھا کہ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر انجیل پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے آخری ایّام کا بیان پڑھتے پڑھتے اُن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، اور جب وہ اِس مقام پر پہنچتے:

"یسوع نے بڑی آواز سے چِلّا کر کہا، ایلی، ایلی، لما شبقتنی؟ یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔"

تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے تھے۔ انہیں فلومینا کو بائیبل کے قصّے سنانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ جہاں فلومینا کا ذہن اپنے نانا کے سنائے ہوئے قصّوں سے متاثر ہو رہا تھا، وہیں اس کے اخلاق پر ماں کی پارسائی تمام شدّت سے اثر انداز ہو رہی تھی۔

میری ہر شام فِلومینا کو چرچ لے جاتی۔ ایسٹر کے روزے رکھواتی۔ اِس حد تک میری کی تربیت کا شُمار نارمل قسم کی تربیت میں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب وہ فِلومینا کو کونوینٹ کی یتیم بچّیوں اور بوڑھی عورتوں کی خدمت پر مامور کرتی یا چرچ کے بڑے بڑے ہال کا فرش گیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کو کہتی تو اُس کے مزاج کی بے اعتدالی کا پتہ چلتا اور مذہب کے معاملے میں اس کے تشدّد آمیز رویّے کا عملی ثبوت بھی مِل جاتا۔

فلومینا چرچ کے پادریوں سے بھی متنفر تھی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پادری ہمیشہ اس کے جسم کو چھونے کا بہانہ تلاش کیا کرتے تھے۔ کبھی وہ اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے تو کبھی حوصلہ بڑھانے کے لئے پیٹھ تھپتھپاتے۔ کبھی ان کا ہاتھ فلومینا کے شانے پر رکھا ہوتا تو کبھی وہاں سے نیچے سرک آتا تھا۔

اس کے برعکس جیمز کی دیدہ زیب اور پُرکشش شخصیت نے فلومینا کی طبیعت کو مردوں کے معاملے میں قنوطی ہونے سے بچا لیا تھا۔ یوں بھی مختلف طریقوں سے جیمز اپنی بیٹی کی دل بستگی کا سامان کیا کرتا تھا۔ وہ اسے بحری قزاقوں اور سمندری ایڈونچروں کے قصے سناتا اور نت نئی کتابیں لا لاکر اُسے دیا کرتا تھا۔ انہیں کتابوں کی بدولت فلومینا کو مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور اسی شوق کی بنا پر وہ امتحانوں میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوتی گئی۔

اس نے مجھ سے یہ بات بھی نہ چھپائی کہ جب جیمز رات کے اندھیرے میں میری سے چھیڑ چھاڑ کرتا تو میری فلومینا کے کمرے میں آکر اطمینان کر لیتی کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ پھر میری اپنے اور اپنی بیٹی کے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر خدا سے مغفرت کی دعا کرتی اپنے بیڈ روم میں چلی جاتی تھی۔ بڑی دیر تک فلومینا دیوار سے کان لگائے اپنی ماں کی دبی دبی سی ہنسی اور اکھڑی سانسوں کے درمیان تیز سرگوشیاں سنا کرتی اور پھر اپنی ٹانگوں کے بیچ میں ایک تکیہ دبا کر سو جاتی تھی۔

گوا کی آزادی کے بعد فلومینا کے والد کے سامنے مسئلہ یہ آیا کہ اب وہ پرتگالیوں کے ساتھ پرتگال چلا جائے یا ہندوستانی حکومت کے زیر اقتدار گوا ہی میں سکونت اختیار کئے رہے۔ انگریزوں کے ساتھ کئے گئے ہندوستانیوں کے ناروا سلوک کا

ذکر جیمز نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا اور ہندوستان کی تاریخ میں بھی پڑھا تھا۔ اس بنا پر اس نے پرتگال کے سفر کا فیصلہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں لندن کی تباہی اور غارت گری کے نتیجے میں جیمز کے کنبے کے سارے افراد مارے گئے تھے۔ اس لئے شہر لندن اس کے لئے اُن عزیزوں اور بزرگوں کی یادوں کا مقبرہ بن چکا تھا۔ پرتگال کے سفر کا فیصلہ کرنے سے پہلے لمحہ بھر کے لئے بھی جیمز کو اپنے مادرِ وطن کا خیال نہیں آیا۔

اُن کا جہاز واسکو کی بندرگاہ سے جب لزبن کے لئے روانہ ہوا تو سمندر پر شفق کا سرخ سایہ پڑ چکا تھا۔ جہاز کے عرشے پر فلومینا جیمز کے بائیں جانب اور میری دائیں جانب کھڑی تھی۔ اور یہ تینوں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کر رہے تھے۔ بوڑھا گنسالویز دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کئے ان کی کامیابی اور سلامتی کی دعا کر رہا تھا۔

اب پندرہ برس بعد فلومینا ہندوستان لوٹی تو اس عرصے میں اس کی دنیا میں کئی انقلاب آچکے تھے!!

اس نے لزبن یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا تھا۔ گراہم گرین پر تھیسس لکھنے کا آغاز کر چکی تھی۔ کسی کالج میں لکچرر بھی ہوئی اور ایک پرتگالی پروفیسر سے شادی کر لی۔ فلومینا نے مجھے بتایا:

"پروفیسر کے رُک رُک کر بولنے کا انداز میرے نانا کا سا تھا اور وہ انہیں کی طرح ذرا جھک کر چلا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے کئی بار ہندوستان کی سیر کا پروگرام بنایا لیکن کسی نہ کسی بنا پر وہ ملتوی ہوتا چلا گیا۔ ہم دونوں میں بڑی چاہت تھی اور ہم

دونوں ایک دوسرے کی فطرت سے خوب واقف تھے۔ دونوں ساتھ پڑھانے کو گھر سے نکلتے اور ساتھ ہی گھر لوٹا کرتے تھے۔ بچپن کی تربیت میرے بڑے کام آرہی تھی۔ میں گھر کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتی تھی اور مجھے اپنے خاوند کی خدمت گزاری میں روحانی سکون ملتا تھا۔"

..... پھر ایک دن .... فلومینا اور پروفیسر لزبن کے سب سے قدیم گرجا میں سے عبادت کر کے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گرجا سے باہر نکل رہے تھے کہ چھت سے ایک پتھر اسرک کر گرا اور سیدھا پروفیسر کے تالو پر آپڑا۔ آنِ واحد میں پروفیسر کی روح قفسِ عنصری کو پرواز کر گئی۔

اس پُرسکوت ماحول میں بیٹھا میں جس وقت فلومینا کی اس قدر پُرپیچ اور اتنی گمبھیر آپ بیتی سن رہا تھا، وقفے وقفے سے میں یہ بھی محسوس کئے جا رہا تھا کہ ایک تیسرا فرد کہیں قریب ہی کھڑا ہماری گفتگو سن رہا ہے۔ میں نے کئی بار اپنے اردگرد کا جائزہ لیا لیکن ہر مرتبہ میری نگاہیں بھٹکتی ہوئیں اس کے پہلو میں رکھے اس بیگ پر جا پڑتیں اور ہر بار میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی ــــ ٹھیک انہیں لمحوں میں فلومینا کی آنکھوں میں گھٹا سی چھا جاتی اور مجھے لگتا کہ بار میں روشنی لمحہ بھر کے لئے مدھم پڑ گئی ہے!

میں نے بل ادا کیا اور ہم دونوں وہاں سے باہر نکل آئے۔ اس نے مجھے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی، جسے میں نے قبول کر لیا۔ اب ہم 'میرامار' بیچ کو جانے والی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ ناریل کے درختوں کا دورویہ سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ مانڈوی نرم روی سے بہہ رہی تھی۔ اِکّادُکّا کشتیاں بھی رواں تھیں۔ دوسرے کنارے پر آباد بستی میں چراغ جل چکے تھے۔

میں نے کہا "برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"میں جانتی ہوں کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ کیوں کہ یہ سوال سبھی مجھ سے کیا کرتے ہیں۔ لیکن میں بات کو ٹال جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو تم بھی جواب سے محروم رہو گے۔

"خیر سبھی لوگوں میں میرا اشمار تم نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ سبھوں کو تم اپنی آپ بیتی نہیں سناتیں۔" یہ جملہ میں نے ہر ہر لفظ پر زور ڈال کر ادا کیا۔ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش رہی۔ مانو دل ہی دل میں فیصلہ کر رہی ہو کہ میرے سوال کا جواب دے یا نہ دے۔ مجھے اس راز سے واقف کرائے یا نہ کرائے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں نے اس کی شخصیت کے اس علاقے میں قدم رکھ دیا تھا کہ جس کی حد بندی پر "نو انٹری" لکھا ہوا تھا۔ پھر وہ رواں ہو گئی۔ انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"تم مجھ سے یہی جاننا چاہتے ہو نا کہ میں نے اسے کہاں پایا؟ اس نے ہاتھ سے اپنے جھولے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔ کب سے میرے ساتھ ہے؟۔۔۔ میں اسے کیوں لئے لئے پھرا کرتی ہوں؟۔۔۔ لیکن ان سوالوں کے واضح جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔۔۔۔ ایک دھندلی سی یاد ہے۔۔۔ شاید یہ میرے ساتھ بچپن ہی سے ہے۔۔۔۔ کسی شام کونوینٹ سے میرے ساتھ ہو لیا تھا۔۔۔ یا یہ اس روز سے میرے ساتھ ہے کہ جب ہم گوا سے لزبن روانہ ہوئے تھے۔۔۔ یا یہ اس دن میرے ساتھ آملا تھا کہ جس دن میرے خاوند کی موت چرچ کے احاطے میں واقع ہوئی۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے

مزید باتیں معلوم کرنے پر اصرار نہ کیا۔ کوئی مانجھی درد بھری آواز میں گا رہا تھا۔ اس کی توجہ میں نے اس گیت کی طرف مبذول کی۔ وہ چونکی۔ گویا خیالستان سے ابھی ابھی واپس ہوئی ہو۔ پھر وہ گیت سننے میں محو ہو گئی۔

جس وقت ہم بیچ پر پہنچے، رات اپنا ڈیرہ ڈال چکی تھی۔ اسٹریٹ لیمپ سے لگے ایک اسٹال سے اُس نے کچھ انڈے، بریڈ اور سیب خریدے اور میں نے ایک بار سے فینی کی ایک بوتل ــــ پھر ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیچ کی نرم ریت پر اُس کے شیک (کیبن نما مکان) کی طرف چلنے لگے۔ سمندر میں مد تھا۔ لہریں دبا دبا سا جوش لئے ساحل پر چلی آ رہی تھیں۔ اس نے اچانک مجھے روکا اور مشرقی افق میں اشارہ کر کے بولی :

" وہ دیکھو "

چاند ناریل کے درختوں کے پیچھے سے دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔

میں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ کسی بچّے کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں شانتی ہی شانتی تھی۔ میں نے دھیرے سے وہ جھولا اس کے شانے سے اتار کر پرے رکھا، اس کے ہاتھ سے پکیٹ بھی لے لیا، فینی کی بوتل کے ساتھ میں نے وہ پکیٹ ریت پر رکھ دیا۔ جب ہم دونوں بالکل آزاد ہو گئے تو میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد اور دوسرا اس کے گلے کے گرد حمائل کر کے اس کے لبوں کا طویل بوسہ لیا۔ بوسے کی لذت سے سرشار ہمارے جسم ایک دوسرے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ پھر ہم دونوں اسی حالت میں دھیرے دھیرے بیٹھنے لگے۔ اور پھر ہم اسی ہم آغوشی کی کیفیت میں لڑھک گئے۔

ابھی ہم ایک دوسرے کو پورے طور پر ٹٹول بھی نہ پائے تھے کہ ایک تیز پھنکار سنائی دی! وہی سنسناتی ہوئی پھنکار! مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے ننگے بدن پر کولڈ اسٹوریج کا دروازہ کھول دیا ہو۔ جس کی برفیلی ہوا کے جھونکوں سے میں منجمد ہوا چلا جا رہا ہوں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا... وہ میری پشت کی طرف رینگ آیا تھا۔ اور اپنا پھن کاڑھے لہرا رہا تھا۔ خوف سے مغلوب ہو کر بڑے اضطراری طور پر ہاتھ کے جھٹکے سے میں نے اسے اپنے سے دور کرنا چاہا۔

"اوہ... نو۔" فلومینا چیخی۔ جیسے مجھ سے کوئی بھیانک غلطی سرزد ہوئی ہو۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ کتنی دیر تک میرے ہاتھ سے چمٹا رہا اور کب الگ ہوا۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ کوئی مجھے سول اسپتال چھوڑ گیا تھا۔ پھر رات دیر گئے سول سرجن کی گاڑی میں میں ہوٹل لوٹا تھا۔

..... اور اب... ہم دونوں اس کی تلاش میں چلے جا رہے تھے۔

اس نے پوچھا "زخم کتنا گہرا ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا "اتنا گہرا کہ میری روح تک اُتر آیا ہے۔"

اس نے کہا "زیادہ رومانٹک بننے کی کوشش نہ کرو۔ اور خود ترحمی کے جذبے سے پرہیز کرو۔"

پھر جیسے مجھے کوئی بات یاد آ گئی۔

میں نے کہا "تم نے کل وہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ گویا مجھے بھی عام لوگوں میں شمار کر چکی ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔"

"تو پھر بتاؤ کہ تم اسے اپنا باڈی گارڈ بنائے کیوں رکھتی ہو؟"

"نہیں میں اسے اپنے ساتھ ہرگز اس لئے نہیں رکھتی کہ یہ میری حفاظت کرے،

یہ تو ... یہ تو ... جیسے میرے شریر کا ایک حصہ ہے، میری آتما اور اپنے آپ سے جیسے اس

کا ابدی تعلق ہے۔ کبھی کبھار مجھے اس سے نفرت ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح کہ جیسے

شدید چوٹ کے نتیجے میں ٹیسیں مارتے ہوئے اپنے جسم کے کسی حصے سے ہمیں نفرت ہو

جائے۔ تو پھر میں ایسی غضبناک ہو جاتی ہوں کہ میں اسے کانٹوں دار جھاڑیوں میں پھینک

دیتی ہوں، اور جب یہ کانٹوں میں پھنسا، دھیرے دھیرے رینگ کر جھاڑیوں سے باہر نکلنے

کی کوشش کرتا ہے تو۔ مجھے اس کے بدن سے رستا ہوا خون دیکھ کر سکون ملتا ہے ... لیکن

... یہ اندھیری راتوں اور بھری برساتوں میں میرے قریب رہا ہے ... مجھ سے چمٹا ہوا ... لپٹا

ہوا، اور یوں مجھے سکون پہنچاتا رہا ہے۔ کیونکہ ... کیونکہ یہ اپنے وجود سے مجھے کسی الیوژن،

کسی فریب میں مبتلا نہیں رکھتا۔ اپنے لجلجے اور ٹھنڈے بدن سے مجھے کوئی لذت یا کوئی

گرمی پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا ... اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ میرے خاوند

کے ساتھ جو زندگی میری گزر رہی تھی وہ اس قدر پُر کیف اور راحت بخش تھی کہ مجھے اس کے

لمحاتی اور عارضی ہونے کا خیال تک نہ آیا۔ میں نے کبھی اُسے قضا و قدر کی حقیقت کے پس منظر

میں نہیں دیکھا۔ اپنی پُر سکوت تنہائیوں میں اُس بے ثبات زندگی کا خیال مجھے

پہروں رلاتا ہے اور یہ میرے پہلو میں بیٹھا مجھے تسلی دیتا رہتا ہے۔"

فلومینا کی ان باتوں نے مجھے مضطرب کر دیا۔ اپنے خوابوں میں بھی یہ نہیں

سوچ سکتا تھا کہ اتنی خوش مزاج لڑکی اندر سے اس قدر ڈسٹربڈ ہو گی۔ اس کے

ذہنی دوزخوں کی تپش کا اندازہ میرے کُند احساسات کو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے باوجود اپنے دل کے چور خانے میں بیٹھی خواہش پر اپنی روایتی ہمدردی کا پردہ ڈالتے ہوئے میں نے کہا:

"مجھے تمہاری کیفیت جان کر بہت دکھ ہوا۔ مجھے ذرا سا بھی احساس نہ تھا کہ تمہارا وجود ایک جہنم بنا ہوا ہے۔ لیکن تم اپنے جیون کو میرے نکتہ نظر سے دیکھو تو وہ تمہیں مختلف نظر آئے گا۔

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور جب اس نے میری طرف اپنی مکمل توجہ مبذول کی تو میں نے کہا: 'یہ سچ ہے کہ شریر اور آتما منش کو بھگوان کے بخشے ہوئے ہیں تمہاری آتما دکھی ہے تمہارا شریر دکھی نہیں۔ ... بلکہ تم نے جان بوجھ کر اس پر دکھ لاد رکھے ہیں یہ دراصل ... یہ دراصل تمہیں بچپن میں دی گئی قنوطی طرز کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ تمہارے دماغ میں یسوع مسیح کی مظلوم زندگی کا اثر اس قدر گہرا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایذا پہنچا کر، اپنی خواہشات کی نفی کر کے ذاتی لذت حاصل کرنے لگی ہو۔ ... مگر یہ یاد رکھو کہ مسیح نے کبھی قنوطیت کا پرچار نہیں کیا۔ بدھ کے کئی سو برس بعد مسیح پیدا ہوئے تھے اور اس لئے نہیں پیدا ہوئے تھے کہ پیٹ کو پیٹھ سے لگا لیا جائے۔ جسم کے گوشت کو سکھا سکھا کر چمڑا بنا لیا جائے ... تمہارے گزرے ہوئے سفر میں اگر صحرا تھا اور بیابانوں کا پرہول سناٹا تھا تو تمہارے اگلے سفر میں شجرِ سایہ دار بھی آئیں گے اور تمہیں پرندوں کا نغمہ بھی سنائی دے گا۔"

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا وہ میری باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سنتی رہی۔ میں پھر بولا:

"سنو... میں چالیس برس کا ہوں اور کنوارہ ہوں۔ جرنلسٹ ہوں اور عزت کی روٹی کھاتا ہوں۔ تم میری زندگی میں بادِ بہاری بن کر آئی ہو۔ مجھے امید ہے کہ ازدواج کے

بندھن میں بندھ کر ہم ایک دوسرے کے دُکھ بانٹ لیں گے ... ممکن ہے یوں ہمیں دل کا چین نصیب ہو جائے۔

اُس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے ... اُن کو اپنے لبوں سے چوما ... آنکھیں موند لیں اور بولی:

"یہ فیصلہ ... یہ فیصلہ اتنا سہل تو ہے نہیں ... نہ تو یہ کوئی فلم ہے اور نہ کوئی افسانہ ہی کہ ہدایت کار یا کہانی کار کی مرضی کے مطابق جب چاہا تبدیلی کر لی۔ یہ فیصلہ میری زندگی کو ایک انجانے جزیرے پر لا کھڑا کرے گا۔ ایسا جزیرہ کہ جس کی ہواؤں کے رُخوں اور موسموں کے مزاج سے میں قطعی ناواقف ہوں گی۔ اس کے باوجود خاطر جمع رکھو ... میں تمہارے پرپوزل پر غور کروں گی ... ممکن ہے کل ... یا پھر پرسوں میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکوں گی!"

پھر وہ ہمیں نظر آگیا۔ ریت پر کنڈلی مارے بیٹھا ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتا جھوم رہا تھا۔ فلومینا نے دوڑ کر اُسے اُٹھا لیا۔ اس کا منھ چوما پھر جسم — وہ اُس کے بدن سے لپٹ لپٹ گیا۔ بالکل اس بچّے کی طرح جو بھوک سے دُہرا ہو کر اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگلے روز جب میں اس کے شیک پر پہنچا تو دروازے پر مجھے وہی گوون لڑکی نظر آئی کہ جسے میں نے ہپّیوں کے جھونپڑے میں چائے کا آرڈر دیا تھا۔

"میم ساب کدھر ہے؟" میں نے دروازے پر پڑے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ساب ... میم ساب ... ابھی ابھی بمبئی جانے والی بس پکڑنے کو گیا ہے۔

"کب... کدھر؟" بے معانی سے الفاظ میرے منھ سے نکلے۔

مَیں تیزی سے دوڑنے لگا۔ میرے تصور میں وہ دوڑی چلی جارہی تھی، اور اس کے جسم کے دائرے اور نیم دائرے اُبھر اُبھر کر ڈوب رہے تھے۔

میں جب بس اڈّے پر پہنچا تمام مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے، سامان لادا جا چکا تھا، بس چلنے کو تیار کھڑی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اسے بس میں تلاش کرنے لگا۔ وہ آخری سیٹ پر کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ اور وہ بیگ چھت سے ٹنگا جھول رہا تھا،

میں نے بے اختیاری سے ہلو کہا۔

وہ مسرت آمیز حیرت سے چیخی۔ "ارے تم... تم یہاں کیسے؟"

"بتاؤ کہاں جارہی ہو؟"

"بمبئی... اور وہاں سے لزبن۔"

"مگر تم نے... تم نے میری بات... میرے پرپوزل..."

وہ بولی:

"آئی ایم سوری... میں نے بہت سوچا"... وہ گمبھیر لہجہ میں بول رہی تھی کہ اسی لمحے بس اسٹارٹ ہوئی اور چلنے لگی۔ مَیں اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔

"تم... تم اسے مار کر" اُس نے جھولے کی طرف اشارہ کیا۔ "کوئی اور میرے گلے میں ڈال دو گے، تب اس کے ساتھ میرا جینا زیادہ دشوار ہو جائے گا... مجھے معاف کر دو اور بھولنے کی کوشش کرو۔" اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں رومال سے پونچھیں اور وہی رومال دور جاتی ہوئی بس سے میری جانب لہرانے لگی۔

قحطِ دمشق گھوڑے اور وہ

دُور سے دیکھنے والے کو اُن کا غول بھورے رنگ کا ٹیلا نظر آتا یا گہرے مٹیالے رنگ کا بادل۔ وہ اچھلتے کودتے، اڑتے، تیرتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے سلو موشن میں فلم چل رہی ہو۔ اگر منظر ساکت ہو جائے تو ان کے نرم نرم بال پیچھے کو اُڑتے ہوئے دکھائی دیں۔ وہ کتنے تھے؟ یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ تعداد میں خاصے تھے۔ اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا تھا کہ جس میدان سے وہ گزر رہے تھے اس کا بہت بڑا حصہ ان کے وجود سے ڈھک چکا تھا، اور میدان کا رقبہ کسی بہت بڑے قصبے کی عیدگاہ کے برابر تھا۔

اس روز سورج اپنی جسامت میں چوگنا ہو چکا تھا۔ ہوا خشک، درخت ننگے اور پانی بھاپ بن چکا تھا۔ پہاڑ پتھر کے کوئلے کی طرح تپ رہے تھے۔ زمین سوکھے ہونٹوں اور بوڑھی چھاتیوں کی طرح تڑخ چکی تھی، اور اس میں پڑی ہوئی دراڑیں ہاتھ پسار پسار کر آسمان سے رحمت کی بھیک مانگ رہی تھیں، لیکن آسمان کی آنکھوں میں بے مروّتی کی سفیدی اُتر آئی تھی، اور وہ ہر التجا اور ہر فریاد کو ٹھکراتا ہوا اوپر بہت اوپر اُٹھ چکا تھا۔

اُس شہر میں کاغذ کے ہزاروں لاکھوں چہروں پر اِس بلائے ناگہانی کا ذکر شاہ سرخیوں میں کر دیا گیا تھا۔

وہ دوست جب شام میں اکٹھے ہوئے تو انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز بھی اسی بات سے کیا:

"اخبار دیکھا؟"

"ہاں، قحط پڑ چکا ہے۔"

"اب تو ہر دوسرے تیسرے سال پڑ جاتا ہے۔"

ایک نے بادشاہ کے گھوڑوں کو گالی دی:

"یہ اپنی ماں ___ رہے ہیں۔"

دوسرے نے کہا:

"ان بھو ___ والوں کو ہماری ذرا بھی پروا نہیں۔"

تیسرا بولا:

"ہر برس تالاب خشک، ہر سال فصلیں تباہ، ان مادر ___ نے آخر کیا مذاق لگا رکھا ہے؟"

جب اِن تینوں نے اپنا اپنا صفرا اور اپنا اپنا بلغم خوب اچھی طرح نالیوں میں اُگل دیا تو پھر یہ چائے خانے میں چلے گئے۔ وہاں دو چار دوست اُن میں اور آملے پھر انہوں نے چار پی، سگریٹ سلگائی اور ادب، فلم اور کام شوتر پر خوب باتیں کیں، پھر ہلکے پھلکے ہو کر گھر لوٹ گئے۔

یہ بھی اور ان کے ساتھ ساتھ اس شہر کے دوسرے باسی بھی اس حقیقت

سے ناواقف تھے کہ وہ مٹیالے رنگ کا بادل دھیرے دھیرے اِن ہی کی بستی کی اور بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

ایک روز قبل آریہ بھٹ اُن کی تصویر اپنے ہیڈ کوارٹر کو منتقل کر چکا تھا، آج بھاسکر نے اپنا فرض انجام دیا۔ رصد گاہ کے تمام سائنسداں سر جوڑ کر بیٹھے اُس تصویر کے نشانات کو ڈی کوڈ کرنے لگے:

"یہ ننھے ننھے ذرات ...."

"پہلے کبھی ...."

"ہاں پہلے کبھی .... لیکن کیا ہو سکتے ہیں؟"

"وہی تو میں سوچ رہا ہوں۔"

انہوں نے بہت سر کھپایا۔

"ٹڈی دل؟"

"ایٹمی گیس؟"

"مہلک وائرس؟ (Virus)؟"

"ریڈی ایٹیڈ ایلیمنٹس "RADIATED ELEMENTS"؟"

کئی گھنٹوں کی مغز پاشی کے باوجود کوئی مناسب سراغ اُن کے ہاتھ نہ لگا۔

دوسری صبح ہزاروں لاکھوں چہرے وہی خبر لیے لوگوں کے سامنے آئے۔ لیکن اب اس کی اہمیت کل جتنی نہ تھی۔ آج اسے ایک بہت ہی چھوٹے سے چوکھٹے میں بند کر دیا گیا تھا۔

ایک اور ناخوشگوار حادثہ رونما ہوا۔ زمین اپنے مدار پر چلتے چلتے سورج کی طرف کھسک گئی۔ شہر کے موسمیاتی بیوریو میں نصب تھرما میٹر کا پارہ اپنا خول توڑ کر زمین پر بکھر گیا۔ تب کہیں جا کر وہ گھوڑے اصطبل میں ہنہنائے۔

ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔

گھوڑے اُس پتھریلی عمارت کی غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے کانفرنس ہال میں پہنچے اور کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے۔

ہنگامی اجلاس کا بڑے اختصار میں مقصد بیان کیا گیا اور اس سلسلے میں گھوڑوں سے مشورہ مانگا گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہال ایک اصطبل میں بدل گیا۔

گھوڑوں کی ہنہناہٹ، چھینکیں اور پیر پٹکنے کی آوازیں ہال میں گونجنے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کو اپنی دُم سے جھاڑنے لگے۔

چند ایک نے اپنی نعلوں کی نمائش بھی ضروری سمجھی۔

وہ جو سبھوں میں کم ہنہناتا تھا لیکن جس کی ہنہناہٹ بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی، بیٹھے بیٹھے اچانک پلٹا۔ دوسرے ہی لمحے ایک باوردی ٹٹّو آگے بڑھ آیا۔

"ایئر کنڈیشنرز آن کیوں نہیں کرتے؟"

"وہ چالو ہیں ساب۔"

"چالو ہیں؟" گویا اُسے اپنے ٹٹّو کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"دیکھو، دربار ہال سے وہ دونوں بڑے پنکھے لے آؤ۔"

ٹٹّو نے ادب سے گردن جھکائی اور مڑ گیا۔

جھیلیں پیاسی تھیں، کھیت بھوکے تھے، ہوا گرم تھی۔ ڈھور ڈنگر سولی

پر لٹک رہے تھے اور خونخوار پرندے اُن کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ تاریخ اپنے کو دُہرا رہی تھی۔ مسیح سے بیسیوں برس پہلے دمشق میں پڑنے والا قحط اور مسیح کے انیس سو سال بعد بنگال میں پڑنے والا قحط۔ وہ اپنے محور پر قائم تھے اور محور مردہ جسم سے جڑا ہوا تھا۔ معاملہ بے حد گمبھیر تھا اور ان گھوڑوں کے لئے دلدل ثابت ہو رہا تھا۔

ٹھیک ایک بجے اجلاس روک دیا گیا۔

جب وہ کانفرنس ہال سے باہر آئے تو سبھوں کو علم ہوا، وہ سب کے سب بھوک سے نڈھال ہیں۔ چار چار چھ چھ کی ٹکڑیوں میں بٹ کر وہ گاڑیوں پر سوار ہوئے اور قریب کے فائیو اسٹار ہوٹل کو چل دیے۔

انہوں نے شدید گرمی کے پیشِ نظر سوئمنگ پول سے لگے ہوئے ریستوران کا انتخاب کیا۔ ملکی اور غیر ملکی عورتیں اور مرد برفیلے پانی میں تیر رہے تھے اور وقفے وقفے سے پول کے کنارے پر اپنی اپنی کشتیوں میں رکھی بیئر بھی پی رہے تھے۔

ایک قدآور چکنی چیپڑی عورت کی چولیوں میں سے اُبلتی ہوئی چھاتیوں کو اپنے تصور میں بھنبھوڑتے ہوئے ایک گھوڑے نے کہا:

"یہاں آنے کے بعد نہ کوئی سمسّیا، سمسیا رہتی ہے، نہ کوئی فکر، فکر۔ لگتا ہے جیون بڑا سکھی، شانت اور آنند پورک ہے۔ LOOK AT THAT BITCH"

دوسرے گھوڑے نے بیئر کے مگ میں سے اُسے دیکھا۔ اب اس عورت کے تھرکتے لچکتے کولہے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ بڑے غضب ناک انداز میں اس نے بھُنی ہوئی مرغی اُٹھالی اور اس پر اپنے ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کے دانت پیوست کر دیے۔

تین گھنٹے یہاں گزارنے کے بعد بھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے، اور رلیس میں

ہارے ہوئے گھوڑوں کی طرح بالکل EXHAUST ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

گہرے مٹیلے رنگ کا بادل، چٹیل میدانوں، ننگے پیڑوں، خشک جھرنوں اور بے آب و گیاہ علاقوں سے گزرتا اس شہر کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

وہ جو سائنسداں تھا اور جو وِگیان منڈل کا ادھیکش تھا، دو دن سے بے کل تھا۔ آج بھی وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹا اُن پُر اسرار نشانات پر غور کر رہا تھا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں اور راکھ کے ڈھیر سے پُر ہو چکی تھی۔ میز پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی خالی ہو چکی تھی۔ یہ اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ پیشانی پر سلوٹیں اُبھری ہوئی تھیں۔ جھنجھلا کر اُس نے دونوں مٹھیوں سے اپنا ماتھا ٹھونکا، پھر بے قرار ہو کر اُٹھا اور تیز قدموں سے کمرہ ناپنے لگا۔ آخر کار اس نے فون اٹھایا اور کسی کے نمبر ملائے۔

بڑی دیر تک اسے اپنے مخاطب کا انتظار کرنا پڑا۔

"یس" وہ ہنہنایا، یہ وہی گھوڑا تھا جو کم بولتا تھا، لیکن جس کی بات دوسرے بڑی توجہ سے سنتے تھے۔

"معاملہ گمبھیر ہے، مجھے کل صبح گیارہ بجے تک ......"

"اچھا میں ایئر کمانڈر سے بات کرتا ہوں۔"

پھڑ پھڑ پھڑ کی بے ہنگم آواز پہاڑوں کے کانوں میں خراش ڈال رہی تھی۔ ایک ہزار فٹ کی اونچائی پر اڑتا ہوا اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے ہوئے وہ زمین کا بڑے انہماک سے جائزہ لے رہا تھا۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے اور اس نے ایک ہزار میل کا علاقہ چھان مارا تھا،

لیکن وہ ......

پائلیٹ نے کہا۔ "آدھ گھنٹے سے پہلے ہمیں ری فیولنگ کرنی پڑے گی۔"

ڈھائی گھنٹے کے بعد دوسری بار ری فیولنگ کرنی پڑی، اور یہ پھر سے ویرانے کی اور پرواز کرنے لگے۔

ادھیکش اپنی آنکھوں پہ دوربین لگائے ہوئے زمین پر مستقل نظر گاڑے ہوئے تھا۔ پچپن سال کا بوڑھا فولاد کا سا عزم رکھنے کے باوجود تھک چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"میں انہیں کیا جواب دوں گا، وہ تو میرا مذاق اڑائیں گے۔ اسی علاقے میں دو روز تک وہ بادل دیکھا گیا، اور اب ایسا غائب ہے کہ جیسے فضا میں تحلیل ہو چکا ہو۔ میں نے رات میں ناحق اسے تکلیف دی۔ بھری نیند سے جگایا، اب میں اُسے کیا جواب دوں گا۔"

وہ بڑی توجہ اور انہماک سے اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، ویسے ویسے اس کے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ کہ اچانک وہ نظر آ گئے۔

پہلے تو اُسے بھورا سایہ سا دکھائی دیا پھر خاکستری بادل سا، پھر وہ!

اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔

پائلیٹ کو اس نے تاکید کی کہ ہیلی کاپٹر کا عمود کم کیا جائے۔

وہ بے شمار تھے، ہزار، دو ہزار، دس ہزار، بیس ہزار۔

بھورے، خاکستری، دبلے پتلے، لمبے، اونچے، انسان کے آباد اجداد۔

اس کے اشارے پر فاصلہ اور کم کیا گیا۔

وہ بڑھے چلے جا رہے تھے، جچے تلے قدموں سے!

اب ادھیکش اُن سے بمشکل سو فٹ کی اونچائی پر تھا! ور انہیں دوربین کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت کمزور اور لاغر تھے۔ اُن میں سے کئی ایک چلنے سے بھی معذور تھے۔ کتنوں کو دوسروں نے اپنے شانوں پر اٹھا رکھا تھا۔ ان میں کئی بچے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جو اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ کئی بوڑھے تھے جو لڑکھڑا لڑکھڑا کر چل رہے تھے۔

اس نے غور سے دیکھا۔

اُن کے چہروں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی، بلکہ اُن کے چہروں پر گہری فکر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں کوئی جان لیوا مسئلہ درپیش تھا۔ اُن کی آنکھوں میں تلواریں چمک رہی تھیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کسی بھٹی میں سے تپ کر نکلے ہیں۔

یہ اُن کا نظم و ضبط، اُن کا عزم و حوصلہ دیکھ کر سہم گیا۔ اب اسے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ شہر کی اور گامزن ہیں اور شہر ان کی آمد سے قطعی غافل ہے۔

اگلی شام میں وہ دوست پھر ملے۔

"آج کا اخبار دیکھا؟"

"ہاں، اب ایک اور خطرہ، تیس ہزار بندر شہر پر حملہ کرنے والے ہیں۔"

"وہ ہم سے زیادہ حساس اور غیرت مند ہیں۔"

"اس میں غیرت کی کیا بات ہے؟"

"اب ہم میں رہی کہاں کو جس کا احساس ہو۔ جانوروں میں باقی رہ گئی ہے کہ جنہوں نے بھوکے پیاسے مرنے کے بجائے جینے کا ہولناک ذریعہ ڈھونڈ لیا ہے۔ دیکھنا تے

جائیں گے، لیکن ہمارے ہاتھ کا نوالہ چھین لینے سے باز نہیں آئیں گے۔"

"یہ دھاندلی ہے۔ ہمارے ہاتھ کی روٹی آخر کیوں چھینی جائے؟"

"دھاندلی نہیں جناب، وہ بھوکے ہیں! اور بھوک کی مار کون سہہ سکتا ہے؟ وہ اپنے بچاؤ کے لئے دوسروں کی جان لینے سے دریغ نہیں کریں گے۔"

باتیں کرتے کرتے وہ اسی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ وہاں ان کے دو چار دوست موجود تھے۔ یہ اُن میں جا ملے۔ پھر حسبِ معمولی ان کی گفتگو کا موضوع ادب، فلم اور کام شُوتر بن گیا۔

جب یہ چائے خانے سے برآمد ہوئے تو بہت ہی ری لیکسڈ (RELAXED) اور ہلکے پھلکے ہو چکے تھے۔

خزانچی سیٹھ نے گھی کا آرڈر ٹیلی فون پر بُک کرتے ہوئے اپنے گاہک سے کہا:

"سیٹھ جی، سُنا آپ نے، تیس ہزار بندروں کا حملہ ہونے والا ہے شہر پر!"

"ہاں سیٹھ یہ کل جُگ ہے کل جُگ۔ اب تو بندر جیسے دو شک ہم پر آکرمَن کرنے لگے ہیں۔"

خزانچی سیٹھ نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"سیٹھ جی پھکر کی کوئی بات نہیں۔ ہماری سرکار اُن سے نمٹ لے گی۔"

ہاں جی، اس سمئے بھی سرکار ہماری سہایتا نہ کرے گی تو پھر کب کرے گی؟ لکھو، پچیس ڈبّے سولا کیلو کے، دس ڈبّے چار کیلو کے......"

اُس پتھّر کی بنی ہوئی عمارت کے کانفرنس ہال میں وہ گھوڑے پھر جمع تھے۔ اُن کی آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں اور مُنہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔

"ہم تیس ہزار بندروں سے کیسے نمٹ سکتے ہیں؟"

"وہ بندر ہی ہیں، ہٹلر کی فوج کے سپاہی تو نہیں۔"

"انہیں گرفتار کر لینا چاہیئے۔"

"انھیں بم سے...."

"زہریلی گیس سے...."

آخر کار وہ جو کم ہنہناتا تھا، لیکن جس کی ہنہناہٹ بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی، اپنی کرسی سے اٹھا اور فیصلہ پڑھ کر سنانے لگا۔

اُس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ نے ان کے چہرے کے تناؤ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ وہ ری لیکسڈ ہو گئے۔

ٹھیک ایک بجے جب وہ کانفرنس ہال سے باہر نکلے تو اُن کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ چار چار چھ چھ کی ٹکڑیوں میں یہ تیل سے چلنے والی گاڑیوں میں سوار ہو گئے اور اسی فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچے اور پھر اس کے سوئمنگ پول سے ملحق ریستوران میں جا بیٹھے ــــ ملکی اور غیر ملکی عورتیں اور مرد برفیلے پانی میں تیر رہے تھے۔

وہ اس مہینے کی دس تاریخ تھی!

سورج پگھل کر آسمان پر پارے کی طرح پھیل چکا تھا۔ اس کے گرم و نکیلے تار زمین کے ذرے ذرے کو چھید رہے تھے۔ وہ بھورے خاکستری بندر شہر

کے باہر ریتلے میدان میں پڑاؤ ڈال چکے تھے۔

اُن کی ننھی منی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

چاندی کی چمکتی نالیاں، بڑے بڑے بدہیئت کیکڑے، سبز پوشوں کی قطاریں، روشنی کی لکیریں۔

اُن کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

اُن میں جو سب سے معمّر بندر تھا اور جس کا احترام سبھی کرتے تھے، بہت افسردہ اور غمگین تھا۔ وہ ہزاروں برسوں پر پھیلی ہوئی بارود، خون اور لاشوں کی بُو سونگھ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں دھماکے، چیخیں، کراہیں اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔

وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بولا:

"میں طے کر چکا ہوں کہ اُن سے خوفزدہ ہو کر جنگل کو واپس نہ لوٹوں، اب میرا ساتھ دینے میں تمہاری جانوں کا خطرہ ہے، اس لئے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ جہاں سے آئے ہو وہیں کو لوٹ جاؤ۔"

انہوں نے بڑے غور سے اُس کی بات کو سُنا۔ اُن کے قائد نے ان کے بھلے کی بات کی تھی۔ لیکن وہ تو کب کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس سفر میں اُن کے ساتھی، اُن کے بچے، اُن کی بیویاں راہ کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے تھے اور ختم ہو چکے تھے۔ بھوک اور پیاس نے انھیں معذور اور چُور چُور کر دیا تھا۔ لیکن یہ جیتا سے جا رہے تھے۔ محض اس عزم کے ساتھ کہ وہ اس شہر کے باسیوں کے منھ کا نوالا ضرور چھینیں گے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ ان کے قدم مضبوطی سے اپنی جگہ پر جم گئے۔ کوئی ایسی

جگہ سے نہ ہلا۔ بلکہ انہوں نے اپنی غرّاہٹ سے اپنے سالار کی کہی ہوئی بات پر برہمی کا اظہار کیا۔

وہ پھر بولا:

"تم نہتّے ہو اور وہ مسلّح، تم نادان ہو اور وہ دانائی میں یکتا، تم گنوار ہو اور وہ مہذّب، تمہیں اپنا حق مطلوب ہے اور وہ تمہیں اس سے محروم کئے ہوئے ہے تم بھوک کے مارے اور پیاس کے ستائے ہوئے ہو اور وہ شکم سیر ہے اور ذخیرہ اندوزی میں ماہر۔ وہ تمہیں آہنی ٹینکوں سے کچل دے گا، بارود سے اُڑا دے گا۔ سنگینوں سے چھید دے گا۔ لیکن اے ظلم و جبر کی آندھی کو سہنے والو، اے زلزلوں اور سیلابوں میں بسر کرنے والو، بڑھو اور بڑھ کر اُسے فنا کر دو۔"

گھمسان کا رَن پڑا۔

گولوں کے دھماکوں سے آسمان دہل اُٹھا، چیخوں، سسکیوں اور کراہوں سے زمین لرز لرز گئی، ننھے منّے بچّوں کی چیخوں سے ہوا سسکاریاں مارنے لگی۔

بہت جلد فیصلہ ہو گیا۔

بھیانک منظر کی تاب نہ لا کر سورج پہاڑوں میں جا چھپا۔ دور دراز کے جنگلوں سے چیل کوّے اور گدھ اس سمت کو پرواز کرتے رہے۔ دوسرے روز جب سورج نے پہاڑوں کی اوٹ سے سہم سہم کر ادھر جھانکا تو وہاں پر ہر شے پس کر، پھٹ کر، بکھر کر، چُور چُور ہو کر اپنی شناخت کھو چکی تھی۔ کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ نہتّے، خانماں برباد، فاقہ زدہ بندروں نے ملک کی فولاد جیسی سنگین اور آگ جیسی تباہ کن طاقت سے مقابلہ کیا تھا۔

وہ گھوڑا کہ جو کم ہنہناتا تھا لیکن جس کی ہنہناہٹ بڑی توجہ سے سُنی جاتی تھی، اپنے بیڈروم میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اس نے رات ہی کو فتح کا شادیانہ سن لیا تھا۔

صبح دس بجے وہ نیند سے جاگا، تو وہ اپنے آپ کو غبارے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، ساتھ ہی اس کا ذہن ہر فکر سے پاک تھا۔

آہستہ سے اُٹھ کر اس نے گون پہنا، ایرکنڈیشنر بند کیا، پھر سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔

فرحت بخش ہوا کا تیز جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا۔ ساری رگوں میں، اس کی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حدِّ نظر تک سمندر شانت تھا۔ مرغابیاں فضا میں غوطے کھا رہی تھیں۔ نیچے اس کے بنگلے کے لاؤن میں اس کے دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ اُس کی بیوی چھتری کے سائے میں بیٹھی رسالے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے سوچا،

سمسیاؤں کے بغیر جیون کا ٹوٹو نہ کٹے، اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ان سمسیاؤں کا حل ہم کیا ڈھونڈتے ہیں۔

ویسے جیون کتنا سکھی اور شانت ہے۔

اس نے تپائی پر رکھا گونگ بجایا۔

باوردی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ "جی شاب"

"آج میں ناشتہ لاؤن میں کروں گا۔ دو ہاف بوئل انڈے، ٹوسٹ اور شہد"

مَردم گزیدہ بستی

لوگ سر اٹھائے ہوئے اُس بھیانک ہاتھ کو تک رہے تھے جو ایک عظیم الجثہ مچھلی کی طرح فضا میں تیر رہا تھا۔ ہزار بارہ سو فٹ لمبا ہاتھ، جمبو جیسا لبے ڈول ہاتھ، اژدہے جیسا فربہ ہاتھ۔

سب اُسی کو دیکھ رہے تھے۔ اُسی کو تک رہے تھے۔ اتنا بڑا ہاتھ اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسے ہاتھ کے بارے میں اُنہوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ کسی داستان میں بھی نہیں اور نہ کسی کتھا میں!

اُنہوں نے ہاتھ کے اس قدر لمبے ہونے کا کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہاتھ اتنا بڑا ہو سکتا ہے۔

ہاتھ واقعی بہت لمبا تھا۔

بہت فربہ تھا۔

بہت کرڑا تھا۔

اُسے دیکھ کر دہشت ہوتی تھی، جی ڈرتا تھا، گمان ہوتا تھا کہ جیسے وہ ملک الموت کا ہاتھ ہو، جو اپنے شکنجے میں کسنے کو ہمارے گلے کی طرف بڑھ رہا ہو یا

فضا میں معلق وہ کوئی چٹان ہو۔ جو کسی بھی لمحہ ہم پر بیٹھ سکتی ہو۔ لیکن وہ تو صرف ایک ہاتھ تھا جسے دیکھ کر دہشت ہوتی تھی، جی ڈرتا تھا۔

"تم کب تک اسے یوں ہی تکتے کھڑے رہو گے؟"

"آں!" وہ جیسے نیند سے چونکے۔

سب کی گردنیں گھومیں۔ سبھی کی آنکھوں سے خوف اُمنڈ رہا تھا۔ وہ چبوترے پر کھڑا تھا

"کیوں دیکھ رہے ہو میری طرف رحم طلب نظروں سے؟"

"کیوں خوف انڈا جا رہا ہے تمہاری آنکھوں سے؟"

"آں!" وہ نیند سے پھر چونک پڑے۔

اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے فقیروں اور سوالیوں کی طرح کیوں کھڑے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ ان کی آنکھوں سے ڈر آنسو بن کر اترنے والا ہے۔ وہ اسی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں امید تھی کہ وہ انہیں راستہ دکھائے گا۔ انہیں اس آفت سے نجات دلائے گا۔

وہ بولا:

"میری طرف رحم طلب نظروں سے مت دیکھو۔ مت ڈرو اس سے۔

وہ کوئی بلا نہیں کہ آسمان سے نازل ہوئی ہو تم پر

وہ کوئی جن نہیں کہ جو فنا کر دے گا تم سب کو۔

وہ ایک ہاتھ ہے۔ صرف ہاتھ۔"

"اتنا بڑا ہاتھ۔ اتنا سنگین ہاتھ! اتنا بھیانک اور ڈراؤنا ہاتھ۔"

"ہاں، وہ بڑا بھی ہے اور سنگین بھی۔ وہ ڈراؤنا بھی ہے اور بھیانک بھی۔
لیکن تمہیں نہ اس کی جسامت سے ڈرنا چاہیئے نہ اس کی سنگینی سے خوف کھانا چاہیئے
اور نہ اس کی صورت سے ہیبت زدہ ہی ہونا چاہیئے۔"

جب یہ جملے ان کے کانوں میں پڑے تو ان کی ڈھارس بندھی۔ ان کے سینوں
میں ٹوٹتی ہوئی ہمت بندھی۔ انہیں اپنے اندر پگھلتی ہوئی قوت کے تھمنے کا احساس ہوا۔

"یہ ... یہ ... کیا ہے؟ یہ ہم پر کیوں مسلط ہے؟ ہم سے یہ چاہتا کیا ہے؟"

وہ مسکرایا۔

"تم اتنے ڈرتے ہو اس سے! اتنے خوف زدہ ہو!!
مجھے تو شبہ ہوتا ہے تمہاری مردانگی پر۔
دیکھتے نہیں کہ وہ ایک ہاتھ ہے۔ صرف ایک ہاتھ!

اور وہ تم پر محض اسی لئے مسلط ہوا کہ تم نے اسے اپنے آپ پر مسلط ہونے
کا موقع دیا۔ اسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی ___ نہ تلوار اٹھائی، نہ بندوق۔ نہ تو جنگ
ہی کی نہ جدّ وجہد۔

اور یہ کوئی پوچھنے کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ دیکھتے
نہیں کہ اس کی مٹھی بھنچی ہوئی ہے اور اس میں سے خون ٹپک رہا ہے۔"

"خون ... خون ... خون ..."

سبھی کے منہ سے نکلا۔ سب ڈر کر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔

کئی اونچی اونچی چمنیاں تھیں۔ ہر چمنی اپنے دہانے سے آگ اُگل رہی تھی اور
شعلے اپنی زبانیں لپ لپا کر وہ خون چاٹ رہے تھے۔

اِس منظر نے انہیں لرزا دیا۔ اور وہ چیخ پڑے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اور یہ..."

"یہ ... یہ خون کس کا ہے؟"

"میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن میں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ یہ خون کس کا ہے؟"

"کیوں ... کیوں نہیں بتاؤ گے تم؟"

"تمہیں اتنی سمجھ تو ہونی ہی چاہیے تھی۔ اپنی جان کا خیال تو کرنا ہی چاہیے تھا۔ اپنی قوّت کے زائل ہونے کا احساس، اپنی کمزوری، اپنی لاغری کی فکر تو تمہیں ہونی ہی چاہیے تھی لیکن تم تو ٹھہرے نِرے مورکھ ——

خیر تم نے کبھی کسی مریض کو اسپتال میں خون لیتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"ہاں ... ہاں دیکھا ہے، دیکھا ہے۔"

"تو تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ بوتل سے ایک نلی لگی ہوتی ہے اور نلی کا دوسرا سرا مریض کی نبض میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔"

اچانک ان کے ہاتھ اپنے دل کی طرف بڑھے۔

ایک لمبی سوئی ان میں سے ہر ایک کے دل میں پیوست تھی اور ایک پتلی سی ٹیوب اس سے منسلک!

کانپتی انگلیوں سے انہوں نے اسے چھوا۔

ٹیوب میں گرم گرم خون دوڑ رہا تھا۔

ان کی انگلیاں ٹیوب پر کپکپاتے ہوئے چلنے لگیں۔ چلتے چلتے سر پر آگئیں، پھر اوپر اٹھیں، اوپر اور اوپر۔ پھر ٹھہر گئیں۔ کیونکہ ان کی رسائی وہیں تک تھی اور ٹیوب کا دوسرا

سر ان کے سروں پر مسلط تھا اور اس ہاتھ سے جڑا ہوا تھا جو اپنی مٹھی بار بار بھینچ کر ان کے جسموں کا خون اوپر کھینچ رہا تھا۔

"اے بھگوان۔ اے رام۔" وہ چیخے اور دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔

ان میں سے کئی ایک نے اس ٹیوب کو اپنے ہاتھوں کے جھٹکوں سے توڑنا چاہا۔

لیکن ٹیوب انتہائی لچک دار تھا۔ وہ اسے جتنا کھینچتے کھنچتا چلا جاتا، یہاں تک کہ دھاگا جیسا ہو جاتا، مگر پھر بھی نہیں ٹوٹتا۔

کئی دوڑے دوڑے جھونپڑوں میں گئے اور وہاں سے چھریاں اور چاقو اٹھا لائے۔ پھر انہوں نے ان ہتھیاروں سے اسے کاٹنا شروع کیا۔ ٹیوب کٹا۔ لیکن وہ ابھی اطمینان کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ اوپر سے ٹیوب کی لمبائی بڑھی اور قدرتی طور پر ان کے دل میں گڑی ہوئی سوئی سے جڑ گئی۔

وہ ٹیوب کاٹتے جاتے تھے مگر ٹیوب کے سرے جڑتے جاتے تھے!

وہ ٹیوب کاٹتے اور سرے جڑتے!

اُن کی لاچاری اور بے بسی قابل دید تھی۔

دراصل ان میں اور لاغر بچوں میں کوئی فرق نہ تھا۔

فرق تھا تو صرف عمروں کا۔

لیکن عمر تو سمجھ دیتی ہے، عقل دیتی ہے۔

حیف کہ ان کی عمر نے انہیں کچھ بھی نہیں دیا تھا۔

یوں بھی وہ کم سمجھ اور کم عقل لوگ تھے۔

وہ کم سننے اور کم بولنے والے لوگ تھے۔

وہ کم کھانے اور کم پہننے والے لوگ تھے۔

وہ ایسی زندگی کے مالک تھے کہ جس کے تقاضے بہت کم تھے!

رہنے کو گز ڈیڑھ گز زمین۔

کھانے کو مُٹھی دو مُٹھی اناج۔

پینے کو پیالا ڈیڑھ پیالا پانی۔

پہننے کو دو چار چیتھڑے۔

اور

ان کم سمجھوں، کم سخنوں، کم سماعت اور کم بصارت رکھنے والوں کی بستی پر

وہ عفریت مسلّط تھا اور ان کے جسموں سے قطرہ قطرہ خون لگاتار چوس رہا تھا۔

وہ بستی شہر کے قلب میں واقع تھی۔

اس کے اطراف میں بڑے بڑے کارخانے تھے۔

بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہوٹل تھے۔ بڑی بڑی تماشہ گاہیں

تھیں۔ بڑی بڑی بینکیں تھیں۔ بڑی بڑی مارکیٹیں تھیں۔

لیکن

اِن کارخانوں، اِن بینکوں، ان مارکیٹوں، ان ہوٹلوں، ان تماشہ گاہوں کو

جانے والے تمام راستے اسی بستی سے ہو کر گزرتے تھے۔ اس بستی کے دل سے۔

جب لمبی لمبی کاریں، بڑی بڑی بسیں اور بڑے بڑے ٹھیلے ان پر سے گزرتے

تو بستی کے بوڑھے، جوان، بچے سب انہیں حیرت سے دیکھتے۔ کبھی کوئی اپنا استعجاب

چُھپا نہ پاتا تو ان رنگ برنگی اشیاء کو دیکھ کر قلقاری مارنے لگتا ـــــ کبھی کوئی ان کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتا! اور کئی ایک نے تو ان کے آگے لیٹ کر ان کو اپنے اوپر سے گزر جانے کا سنسنی خیز تجربہ بھی کیا۔

لمحے منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں، دن سالوں میں اور سال صدیوں میں منتقل ہوتے رہے۔ اور اسی طرح خون اِن باریک باریک ٹیوبوں کے ذریعہ قطرہ قطرہ اس ہاتھ میں جمع ہوتا رہا۔

وہ دن بہ دن سیاہ سے سیاہ تر، کمزور سے کمزور ہوتے گئے۔ اب تو اُن کی کمریں بھی جھک چکی تھیں۔ انہیں دکھائی بھی نہیں دیتا تھا، وہ سن بھی نہیں سکتے تھے اور بولنا تو وہ کب کا بھول چکے تھے۔ بس ایک دوسرے کو چھُو کر ایک دوسرے کی ضرورت سمجھ لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اپنی ضرورت خود پوری کر سکیں۔

چبوترے پر کھڑا ہوا شخص بھی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب کھڑے رہنے کے لئے اُسے عصا درکار تھا۔

وہ انہیں آواز دیا کرتا۔

"جاگو ، اُٹھو ، بڑھو"

لیکن اس کی آواز اُس کے گلے ہی میں گھُٹ کے رہ جاتی۔

وہ پکارتا:

" جاگو ، اُٹھو ، بڑھو۔"

لیکن الفاظ اس کے ذہن ہی میں گونج کر رہ جاتے۔

وہ چیخ کر کہتا۔

"جاگو، اُٹھو، بڑھو۔"

بس اُس کے صرف لب پھڑپھڑاتے لیکن منہ سے آواز نہ نکلتی۔

ایک دن

سارا عالم بقا... تحفظ... بقا... تحفظ... بقا... تحفظ... بقا ... تحفظ... کے شور سے گونجنے لگا۔

انہیں یاد آیا۔

یہ الفاظ ہزاروں سال پہلے گھنے جنگلوں، اندھے غاروں میں انہوں نے سُنے تھے۔ یہی وہ الفاظ تھے جو انہوں نے آتش فشاں کے پھٹنے سے پہلے سُنے تھے۔ یہی وہ الفاظ تھے جو انہوں نے زلزلوں اور سیلابوں میں گھرے ہوئے اپنے ساتھیوں سے سُنے تھے۔

اور آج

وہی آواز صدیوں کا سینہ چیرتی ہوئی ان تک پھر پہنچی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ اُنہی میں سے چند نوجوان اُٹھے، گویا ان کے کانوں میں صور پھونک دیا گیا ہو یا اس آواز پر لبیک کہنے وہ اُٹھے ہوں۔

یا اس آواز کا خیر مقدم کرنے کے لئے؟

وہ آہستہ آہستہ چل کر اس بوڑھے تک پہنچے جو اب بھی عصا تھامے چبوترے پر کھڑا امن منا رہا تھا۔

"جاگو، اٹھو، بڑھو، جاگو، اٹھو، بڑھو۔"
انہوں نے اسے اپنے شانوں پر اٹھایا اور دور لے جاکر ایک چارپائی پر لٹا دیا۔

پھر وہ خود اس چبوترے پر جاکر کھڑے ہو گئے۔
اور ایک ساتھ وہ اپنی پوری قوت سے چیخے۔
"سنو! غور سے سنو۔
سنو! غور سے سنو۔
سنو! غور سے سنو۔"
ان کی آواز ان کم عقلوں، کم سمجھوں کے کانوں میں پڑی۔
جو ضعیف ہو چکے تھے ان کے تو صرف کان ہی بجے، جو تندرست تھے صرف وہی سن پائے۔

"ہمیں قربانی دینی ہوگی۔
قربانی دینی ہوگی۔
دینی ہوگی۔"
"ہمیں اپنی نجات کا سامان کرنا ہوگا۔
نجات کا سامان کرنا ہوگا۔
سامان کرنا ہوگا۔"
"ہمیں اپنے لئے اور اپنی آئندہ نسل کے لئے اپنی جان دینی ہوگی۔
آئندہ نسل کے لئے جان دینی ہوگی۔

جان دینی ہوگی۔"

"ہمیں جاں بازوں کا گردہ تیار کرنا ہوگا۔

گردہ تیار کرنا ہوگا۔

تیار کرنا ہوگا۔"

"ہمیں اپنے ہاتھوں سے اپنی رگیں کاٹ کر خون دینا ہوگا۔

رگیں کاٹ کر خون دینا ہوگا۔

خون دینا ہوگا۔"

"جنہیں بار بار مرنے کے بجائے یک لخت جان دینا عزیز ہو۔

اور

جو قطرہ قطرہ خون دینے کے بجائے اکٹھا خون دینا چاہتے ہوں وہ آگے بڑھیں۔

آگے بڑھیں۔

ہم تک، ہمارے دلوں تک۔"

کوئی آگے نہ بڑھا۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کسی نے جنبش تک نہ کی۔

نوجوان اپنی اپیل دہراتے رہے۔

"سنو! غور سے سنو، سنو! غور سے سنو۔"

ہمیں قربانی دینی ہوگی، قربانی دینی ہوگی۔

ہمیں اپنی نجات کا سامان کرنا ہوگا، نجات کا سامان کرنا ہوگا۔

ہمیں آئندہ نسل کے لئے اپنی جان دینی ہوگی، جان دینی ہوگی۔

ہمیں جاں بازوں کا گردہ تیار کرنا ہوگا۔ گردہ تیار کرنا ہوگا۔

ہمیں اپنی رگیں کاٹ کر خون دینا ہوگا، خون دینا ہوگا۔
جنہیں لمحہ لمحہ موت کے بجائے اچانک موت کی خواہش ہو اور جو قطرہ قطرہ خون کے بجائے اکٹھا خون دینا چاہتے ہوں۔
وہ آگے بڑھیں۔ آگے بڑھیں۔
ہم تک، ہمارے دلوں تک۔"
کوئی آگے نہ بڑھا، کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا، کسی نے جنبش تک نہ کی۔
سورج مشرق سے چلتے چلتے نصف النہار پر پہنچا۔
پھر ڈھلنے لگا۔
اور رُوپوش ہو گیا۔
پھر سورج نکلا، نصف النہار پر پہنچا، پھر ڈھل گیا۔
کتنے سورج نکلے، کتنے نصف النہار پر پہنچے اور کتنے روپوش ہو گئے؟؟
نوجوان بدستور اپنے الفاظ دہراتے رہے۔
"سنو! غور سے سنو، سنو! غور سے سنو، سنو! غور سے سنو!"
اِس مجمع پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
وقت لمحوں میں۔
اور خون قطروں میں بٹتا رہا۔
یوں محسوس ہونے لگا کہ اب یہ لوگ کاٹھ کے پُتلوں میں بدل جائیں گے اور منظر فریز (FREEZ) ہو جائے گا۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ہوا یہ کہ پہلے تو دور سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔
پھر یہ بھنبھناہٹ بتدریج تیز ہوتی گئی۔
مجمع میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں اور مردوں کی طرح ساکت کھڑے ہوئے لوگ حرکت کرنے لگے تھے۔
وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔
اور ہاتھوں کے اشارے سے کسی کی نشان دہی کر رہے تھے۔
اچانک وہ مجمع دو حصوں میں بٹ گیا۔
ایک نوجوان لڑکا سینہ تانے، گردن اٹھائے تیز قدموں سے چلتا ان کے درمیان میں نظر آیا۔ وہ چبوترے ہی کی طرف آ رہا تھا۔
چند لمحوں کے بعد وہ لڑکا اس چبوترے کے پاس پہنچ گیا۔
چبوترے پر کھڑے ہوئے نوجوانوں کے چہرے دمک اٹھے۔
مجمع میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔
وہ دبے دبے جوش کے ساتھ مختلف آوازیں نکالنے لگے۔
ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگے۔
چبوترے پر کھڑے ہوئے تمام نوجوان اس لڑکے کے استقبال کو نیچے اُتر آئے۔ انہوں نے باری باری اس کا ماتھا چوما، اُسے گلے لگایا۔ پھر اسے لے کر وہ مجمع تک پہنچے۔
مجمع میں شامل ہر شخص سے انہوں نے اس نوجوان کا تعارف کرایا۔
اُن کے تعارف کا انداز بالکل نرالا تھا۔

پہلے وہ مجمع میں کھڑے آدمی کا نام معلوم کرتے۔ وہ شخص جو نام بتاتا اسی نام سے یہ اس نوجوان کو اس شخص سے متعارف کراتے۔ اس نوجوان کو مجمع کے تمام لوگوں سے فرداً فرداً اسی انداز سے جب وہ متعارف کرا چکے تو پھر وہ چبوترے پر چڑھ گئے۔

اب وہ وقت آچکا تھا۔

نوجوانوں کی آنکھیں روشن تھیں۔ چہروں پر عزم و جلال کی سُرخی!

انہوں نے ایک ساتھ گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

وہ ہاتھ عظیم الجثہ مچھلی کی طرح فضا میں تیر رہا تھا۔

پھر انہوں نے اپنی نظریں نوجوان پر مرکوز کردیں۔

وہ نوجوان گویا ان کی ہدایت کا منتظر تھا۔

انہوں نے پھر اُسے اپنا فرض ادا کرنے کی اجازت دے دی۔

وہ نوجوان دو قدم آگے بڑھ کر چبوترے کے سرے پر پہنچ گیا۔

بجلی کی سُرعت سے اس نے اپنی جیب سے چاقو نکالا۔

چاقو کی نبض پر انگلی رکھی۔

ہاتھ فضا میں بلند کیا۔

چاقو کا پھل نیزے کی انی کی طرح چمچمانے لگا۔

وہ زور زور سے نعرے لگانے لگے

ہاتھ اُٹھا اٹھا کر اپنے جوش کا مظاہرہ کرنے لگے۔

نوجوان نے چاقو کے دستے کو اپنی دونوں مُٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کا پھل

اپنی جانب کیا۔

دوسرے ہی لمحے۔

اس نے وہ خنجر اپنے دل میں اتار دیا۔

اسی لمحہ، اسی پل

وہ ہاتھ، وہ عظیم الجثہ ہاتھ، وہ جمبو جیسا بے ڈول ہاتھ،

وہ اژدہے جیسا فربہ ہاتھ، وہ فولاد جیسا کڑا ہاتھ

اچانک لرزا

اور بڑی دیر تک لرزتا رہا۔

اکبر

کمرہ نیم تاریک تھا۔ اس میں رکھی ہوئی ہر چیز میلی نظر آرہی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

اور ہم دونوں کے درمیان میں ہمارے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ تپائی کے بازو میں شراب کی بوتل اور اُس مسہری کے قریب جس سے اُس نے اپنی پیٹھ ٹِکا رکھی تھی، پانی کی پتیلی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا، پھر ہتھیلی کی پشت سے اپنے لبوں کی نمی پونچھ کر اُس نے سگریٹ سلگایا اور بولا:

"انور بھائی! آپ دیکھ رہے ہیں، اس کمرے کی ہر چیز گندی ہے، یہ بستر اس نے مسہری پر ہاتھ مار کر کہا۔" یہ چادر، یہ تولیہ، یہ چٹائی جس پر آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

کمرہ واقعی گندہ تھا۔ لیکن یہ کمرہ تو برسوں سے ایسا ہی تھا۔ آج اسے کمرے کی گندگی کا خیال کیوں آیا! اور آج یہ اتنا افسردہ کیوں ہے؟ اس کے دل میں کون سا غم ہے کہ جو عنقریب ظاہر ہونے والا ہے۔

"سالا یہ کمرہ ہی گندہ ہے اور یہ چالی ....."

اُس نے گالی دی .... ایک موتری ہے، ایک سنڈاس ہے، اور یہ محلہ .... ایک فاحشہ کی شرم گاہ ....."

وہ پھر خاموش ہوگیا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اس کا پیگ بنایا اور سگریٹ کا کش لے کر سوچنے لگا۔ پچھلے تیس برسوں سے وہ یہیں، اسی کمرے میں رہ رہا ہے۔ اس زمانے سے کہ جب وہ نیکر پہنا کرتا تھا اور آنکھوں میں سُرمہ لگاتا تھا اور بستہ پیٹھ سے لٹکائے مدرسے جانے کے لئے چلتی ٹرام پر سوار ہو جایا کرتا تھا، تو اس وقت اُسے اِس محلے کی بدکاری کا احساس نہیں ہوا تھا! اُن دنوں تو جب بھی کوئی سودا خریدنے کے لئے وہ کرانے کی دوکان پر پہنچتا یا اپنے ابا کی سگریٹ لینے وہ بیڑی والے کی دُکان پر جاتا تو راہ میں پڑنے والے رنڈیوں کے ہر کٹھرے سے اُسے کوئی نہ کوئی سیٹی، کوئی نہ کوئی فقرہ، کوئی نہ کوئی اشارہ یا کوئی نہ کوئی بلاوا ایسا نہ ہوتا جو اُس کے رگ و پے میں ہلچل نہ مچا دیتا۔ اُس کے پَیر وزنی ہو جاتے اور آنکھوں میں عقاب آکر بیٹھ جاتا۔

پھر وہ سودا لے کر چالی کی بے شمار سیڑھیاں چیتے کی سی پھُرتی سے طے کر ڈالتا۔

اُسے محلے میں رہنے والوں کی بدقماشی کا احساس اس وقت بھی نہ ہوا تھا کہ جب اُس نے سولہ برس کی عمر میں ایک نیپالی لڑکی کے ساتھ ساڑھے تین روپے کے معاوضے پر پھل توڑا تھا۔

اور آخری لمحوں میں کہ جب جسم کی لذت روح بھی محسوس کرنے لگتی ہے اور اپنی سیرابی کے اعتراف میں اپنے پوشیدہ مخزن سے جسم کو جوہری توانائی

بخشتی ہے۔ اُسے اپنے ماحول کی غلاظت کا احساس نہیں ہوا تھا! اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بیاہ ہو گیا۔ پھر اس کے یہاں اولاد ہوئی! اور وہ اپنے کام کاج میں زیادہ منہمک ہو گیا۔ تب بھی اُسے محلے کی گندگی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آج میں کیا کیا بک رہا ہوں۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج آپ بہت ڈسٹربڈ ہیں! اور اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"ہائے... ہائے...!! کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس چھوڑی اور کہنے لگا۔ "آپ اکبر کو نہیں جانتے۔ پھر بھی آپ نے کسی گورے چٹے، غمگین آنکھوں، منتشر بالوں والے ایک انتہائی کمزور لڑکے کو اس جالی میں دیکھا ہوگا ____"

چونکہ میں اس کی کھولی پر برسوں سے آتا جاتا رہا تھا۔ لیکن میں نے جالی میں بیٹھی ہوئی عورتوں، لڑکیوں، بچوں اور مردوں کو کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔ شاید اسی لئے جالی والے بھی ہمارے پینے پلانے پر معترض نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جس لڑکے کا حلیہ اس نے بتایا تھا میں نے اسے بارہا دیکھا تھا وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ لڑکا سیڑھی کے بالکل سامنے بیٹھا پُرسوز آواز میں قرآن پڑھا کرتا تھا۔

اس کی آواز میں اس قدر سوز تھا کہ لمحہ بھر کے لئے میرے ہاتھوں میں دبی ہوئی شراب کی بوتل لرز جاتی تھی۔ دو ایک مرتبہ شراب نوشی کے درمیان جب پیشاب کرنے کو مجھے اس کے سامنے سے گزرنا پڑا ____ (چونکہ پاخانے جالی کے پچھلی سمت میں تھے) تو اس کی پُرسوز تلاوت کو سن کر میں اپنی ڈگمگاتی چال پر قابو نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قرآن کی تلاوت سُن کر میرے ہاتھوں میں

سے بوتل کیوں پھسلنے لگتی تھی یا میری چال پر مجھے اختیار کیوں نہیں رہتا تھا، اور میں اُس کے سامنے دو ایک مرتبہ کیوں گر پڑا تھا، میں نے بارہا اس بات پر غور کیا تھا اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ اس کی پُر سوز اور پُر درد آواز کا اثر تھا جو میرے شعور پر اثر انداز ہوتی تھی، اور اس حد تک ہوتی تھی کہ ذہن اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا۔

یا بنیادی طور پر مسلمان ہونے کے نتیجے میں شراب نوشی اپنے تمام لُطف و انبساط کے باوجود ایک گناہ کبیرہ ہی لگتی اور میں اپنے ضمیر سے نبرد آزمائی کر کے اسے زیر کر لیا کرتا تھا۔ لیکن جوں ہی میں اس کی پُر سوز تلاوت سُنتا تو میرے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے اور گناہ کا شدید احساس مجھے زندہ درگور کر دیا کرتا تھا۔

"دیکھا تھا۔" میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس لڑکے کا ذکر جاری رہے اور میرا نشہ بگڑے۔

"آج وہ مر گیا ___ جالی میں جس جگہ بیٹھ کر وہ قرآن پڑھا کرتا تھا وہیں اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اطراف خون پھیلا ہوا تھا اور اس کا گریبان بھی خون آلود تھا۔"

یہ کہتے کہتے اس نیم تاریک کمرے میں مجھے نظر نہ آنے والے آنسو اس نے اپنی ہتھیلی کی پشت سے پونچھے اور پھر کھڑکی سے نظر آتے تاریک آسمان کو دیکھنے لگا۔

شہر میں رہتے رہتے میں بے حس ہو چکا ہوں۔ اس شہر کی سنگینی نے میرے دل پر ٹن کی چادر مڑھ دی ہے۔ اور اس کی سمیت (Pollution) تمام غبار، دھند اور دھوئیں سمیت میرے دماغ میں اتر آئی ہے۔

اِس لئے لوگوں کے مرنے مارنے، لُٹنے لُٹانے کی خبریں مجھے مضطرب نہیں کرتیں۔ لیکن پھر بھی میں رات کی تنہائیوں میں اندھیرے سے ڈر ڈر کر مرنے والوں پر آنسو بہایا کرتا ہوں! ور جبر و استبداد سے پناہ مانگا کرتا ہوں۔ اس خبر نے پہلے تو مجھ پر مکمل بے حسی طاری کر دی۔ پل بھر کے لئے مجھے اپنے دل کی دھڑکن سیسے پر ٹھونکی ہوئی ہتھوڑی کی آواز سے مشابہ لگی۔ پھر اسی معدنی خول میں کسی چیز کے پگھلنے کا احساس ہوا۔ میرے جسم کا درجۂ حرارت اچانک گرنے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میری پیٹھ اور پیشانی کے مسامات سے تیزی سے بہہ نکلا۔

میں نے اپنا پیگ تازہ کیا۔ اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ پھر میں نے رومال سے ماتھا پونچھا، ایک گہری سانس لی اور دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا تو وہ گویا ہوا:

"رات میں اسے خون کی قے ہوئی، وہ تڑپا اور مر گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کے سینے میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بات اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ آج انیس میاں کا چھوٹا لڑکا اپنی ماں کو بتا رہا تھا کہ اکبر کی کیفیت کیا تھی ویسے اُس نے اِس لڑکے سے بھی وعدہ لے رکھا تھا کہ وہ اس کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہے گا۔"

میں سوچنے لگا:

آخر کیا بات تھی کہ وہ درد سہے جا رہا تھا۔

اطراف میں اُس کے رشتہ دار نہ سہی۔ لیکن ہمدرد ایک نہیں بیسیوں تھے۔ اور برسرِ روزگار ہونے کے باوجود وہ اپنے علاج معالجے سے آخر کیوں بچ رہا تھا؟

وہ بولا: "چالی کے سبھی لوگوں کو معلوم تھا کہ اسے ٹی۔ بی ہے۔ لیکن کوئی

بھی نہیں جانتا تھا کہ مرض کس اسٹیج پر ہے۔"

میں نے سوچا۔ اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے کا یہ محض ایک بہانہ ہے۔ وہ آگے بولا:

"بھائی! آپ کو نہیں معلوم، جب میں اپنی اِس کھولی پر بالکل تنہا ہوا کرتا اور شغلِ مئے نوشی میں کوئی لطف نہ آتا تو میں اُسے بلا لیا کرتا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ مَیں شغل کیا کرتا اور وہ بیٹھا میرا منھ تکا کرتا۔ شروع میں تو مَیں اس کی موجودگی ہی سے لطف لیا کرتا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جس شخص کے بال بچے وطن میں ہوں اور اس شخص کو اپنے گھر پر دم دے کر چائے پلانے والا کوئی بھی نہ ہو، چالی میں بچوں کے دوڑنے، بھاگنے، ہنسنے اور قہقہے مارنے کی آوازیں سنائی دیں اور کوئی اس کے گھر میں آمد کے بعد پیروں سے لپٹنے یا کندھے پر چڑھ کر کھیلنے والا نہ ہو، یا رات کی تاریکی میں دن بھر کے غیر یقینی اور نامساعد حالات سن کر تسلّی دینے والا نہ ہو۔ تو وہ شخص کسی خاموش پسند لڑکے کو اپنے سامنے بٹھا کر اپنے آپ کو تسلّی نہ دے یا اس کی صحبت پر شکر نہ کرے تو پھر کیا کرے؟ آخر اندھیرے میں بیٹھ کر رو دے بھی تو کب تک؟

اُس نے مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتائی کہ جس سے میں پہلے سے واقف نہ تھا۔ میں نے بارہا اُسے اپنی بیوی بچّوں کو وطن سے یہاں بلوا لینے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اپنی ضعیف ماں کے احترام میں اپنے وطن کی غیر صنعتی، غیر شہری فضا، اس کا فطری حُسن، اس کے سادہ لوح رشتے دار، عزیز و اقارب، اور پھر ایک دن اپنے وطن مراجعت کر جانے کی اُمید میں اس نے تیس برس کا بن باس اِس شہر میں

کاٹ دیا تھا۔

ایک دن میں نے اکبر سے پوچھا۔" اس نے سگریٹ جلا کر جلتی تیلی کو اپنے چہرے کے قریب لا کر دیکھا اور بولا:

"میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں تم اکیلے ہی رہتے ہو تمہاری ماں کہاں ہے اور تمہارے باپ؟"

"انور بھائی! میرا سوال سُن کر وہ سِمٹ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میرے سوال سے وہ خائف ہو گیا ہے تو موضوع بدلنے کی خاطر میں نے اس سے پوچھا" تمہارے دوست کتنے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟

آپ جانتے ہیں ان سوالوں کا جواب مجھے کب ملا؟ اب سوچتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے تقریباً تین برس کے عرصہ پر اس کے جوابات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

آپ مسیح علیہ السلام کو جانتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مصلوب کر دیئے جانے سے پہلے کئی من وزنی صلیب اُن کے شانوں پر لاد دی گئی تھی اور وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے بیت المقدس کے اندھیرے راستوں اور تاریک گلیوں میں اسے اُٹھائے اٹھائے پھرتے رہے۔

اکبر کے شانوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے پورے وجود پر اپنے باپ کے گناہ کی صلیب پڑی رہی جس کا بوجھ اس نے ہر سانس محسوس کیا۔ اُس نے اندھیرے میں ڈراؤنے خواب دیکھے اور دھاڑیں مارتا ہوا اُٹھا لیکن اس کے قریب کوئی نہ تھا جو اس کی ڈھارس بندھاتا اور اُسے دو گھونٹ پانی پلاتا!!

"انور بھائی! اُس نے مجھ سے بارہا کہا کہ میں جانتا ہوں مرنے کے بعد مجھے تمام دُکھوں سے نجات مِل جائے گی۔ میں اُسے ڈپٹ دیتا۔ کیسی قنوطی باتیں کرتے ہو، یہ تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، تمہیں تو ابھی دنیا دیکھنی ہے۔ ایسی افسردہ باتیں ہرگز نہ کرنا ــــ وہ میری ڈانٹ سن کر خاموش ہوجاتا اور خلاء میں گھورنے لگتا۔ گویا وہاں کسی سے ہم کلام ہو اور دونوں ایک دوسرے کو انہماک سے سُن رہے ہوں"ــــ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں سوچنے لگا کہ آخر اس لڑکے کے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ہوگا کہ جس نے اسے اس قدر بُجھا کر رکھ دیا تھا۔

بچے" اپنے والدین کی جدائی یوں بھی برداشت نہیں کرتے اور اگر کر بھی لیں تو ان کی شخصیت پر افسردگی کا پردہ پڑا رہتا ہے۔

وہ بولا: "مرنے سے ابھی ہفتہ بھر پہلے اس نے مجھے بتایا کہ آپ پوچھتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔ یا یہ کہ ڈرتا رہا کہ اگر آپ نے کبھی حقیقت جان لی تو مجھے اپنے پاس پھٹکنے بھی نہ دیں گے۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب میں چند روز کا مہمان ہوں۔ شاید ہفتہ عشرہ میں یہاں سے منتقل ہو جاؤں گا۔ آج کل وضو کر کے سوتا ہوں، کپڑے بالکل پاک صاف رکھتا ہوں، کسی کا قرض مجھ پر نہیں ہے ویسے اپنی پیٹی میں کچھ رقم محفوظ کرلی ہے وہ میرے کفن دفن کے کام آئے گی۔"

میرا جی چاہا کہ جھک کر اُلٹے ہاتھ کا ایسا تھپڑ رسید کروں کہ وہ لڑھک کر اُدھر جا پڑے۔

شاید وہ میرے چہرے کے تاثرات کو سمجھ چکا تھا۔

"تو انور بھائی جانتے ہیں اُس نے کیا کہا:

وہ بولا کہ آپ میرے بزرگ ہیں، میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے مجھے کہنے سے روک دیا تو آپ کبھی میری حقیقت نہیں جان پائیں گے۔ اس لئے میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدل دئے! اور اس کی باتیں سننے کو طوہاً د کرہاً اپنے آپ کو راضی کر لیا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

مئں سمجھ گیا کہ آخری پیگ کے انتظار میں اس نے بات روکی ہے۔ میں نے پیگ بنا کر خالی بوتل مسہری کے نیچے لڑھکا دی۔ پھر سگریٹ سلگایا، کش پہ کش لگائے اور یوں وہ اپنے اندر کی بھٹّی کی تپش بڑھاتا رہا۔

"اس کی ماں کا ______ انور بھائی یہ کمرہ گندہ ہے۔ اتنا گندہ کہ یہ کھُڈّی بن گیا ہے۔

اور یہ چالی سالی۔ بھرا ہوا، اُبلتا ہوا سنڈاس ہے۔ اور یہ محلہ، یہ روڈ، یہ رنڈی بازار ______ کسی فاحشہ کی شرم گاہ۔۔۔۔۔

آپ جانتے ہیں یہاں کتنے پاپ پلتے ہیں اور کتنے گناہ کا بوجھ لئے یہاں مسیح پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔

نہیں آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

اکبر ایک بھڑوے کا بیٹا تھا۔

اور

اُس کی ماں ایک رنڈی تھی۔"

پھر اُس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھٹکے سے اٹھایا اور جالی کی بالکونی میں آکر اُس نے سامنے کے ایک نیم تاریک کٹہرے کی طرف انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا۔

"دیکھئے..... دیکھئے..... اُس رنڈی خانے میں اکبر کا جنم ہوا تھا اور سنِ شعور..... یہ کہتے کہتے اس نے بڑی سی قے کردی۔

میں نے اس کٹہرے کو غور سے دیکھا۔

کٹہرے کی سلاخوں سے لگے اب بھی چند سائے کھڑے تھے۔

..... اور..... کسی کے منتظر تھے۔

چوپال میں سُنا ہوا قصّہ

گاؤں کی چوپال ویران پڑی ہوئی ہے۔ پوہ کی رات ہے۔ برفیلے جھونکوں سے برگد پر ٹنگی قندیلیں جھول جھول جاتی ہیں... ایک بوڑھا گاؤں سے دور چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں اُس کے فاختہ ہے اور دوسرے میں کتاب۔ پیچھے پیچھے اُس کے ایک گدھا چلا جاتا ہے، پیٹھ پر جس کی ایک صندوق لدا ہوا ہے اور وہ صندوق مقفّل ہے۔

گاؤں کی وہی چوپال ہے، لیکن اب آباد ہو چکی ہے۔ متعدد لوگ کانپتے لرزتے چوپال میں بیٹھے ہیں اور قصّہ گو سے قصّہ سن رہے ہیں۔

قصّہ گو کہتا ہے۔ "قصّہ کوتاہ ـــــ وہ کھیل برسوں پہلے جاری ہوا تھا، اب تک جاری ہے اور اس شدت سے جاری ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

مجمع میں سے کوئی پوچھتا ہے:

"بھائی! وہ کونسا کھیل ہے جو برسوں پہلے جاری ہوا تھا اور اب تک جاری ہے اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا؟"

قصّہ گو کہتا ہے: "کیا نووارد ہو اِس گاؤں میں، جو اِس کھیل سے واقف نہیں۔"

وہ شخص جواب دیتا ہے:

"ہاں بھائی! مسافر ہوں ___ سفر میں رات پڑ گئی سو آپ کے گاؤں کی سرائے میں رک گیا۔"

تب قصہ گو کہتا ہے۔ "چوپال میں بیٹھے اِن لوگوں سے پوچھ دیکھو، ممکن ہے ان میں سے کوئی سنائے تمہیں وہ کھیل والا قصہ ___ میں قصہ گو ہوں۔ میرا کام ہر رات نئے نئے قصے سنانا ہے۔ کل کا قصہ ادھورا رہ گیا تھا، سو آج اسے مکمل کر دیا۔ اب نیا قصہ سنانے جا رہا ہوں۔"

وہ بوڑھا ایک ہاتھ میں فاختہ کو تھامے اور دوسرے میں کتاب اُٹھائے ایک قصبے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ گدھا بدستور اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے کہ پیٹھ پر جس کی صندوق لدا ہوا ہے اور وہ صندوق مقفّل ہے۔ اس قصبے میں سبھی کچھ ہے لیکن آدم نہیں! آدم زاد نہیں!! مکانات ہیں، دکانیں ہیں، بازار ہیں، عبادت گاہیں ہیں، مدرسے ہیں، کھیل کے میدان ہیں، سڑکیں ہیں، چوراہے ہیں، چوراہوں پر نصب مجسمے ہیں، رفاہِ عامہ کے دفاتر ہیں، عدالتیں ہیں، ٹکسال ہے۔ سواریاں ہیں، لیکن آدم نہیں! آدم زاد نہیں!!

قصہ گو کہتا ہے: "تو صاحبو! بستی کے حاکم نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور آخری بار اپنی تاکید کو دوہراتا ہوا بولا کہ دیکھ وہاں پہنچ کر تو اپنے فرض سے غافل نہ ہو جانا ... عیش و نشاط میں نہ پڑنا ... تیری گمرہی کا سارا سامان ہو گا وہاں ... لیکن سُن کہ جب وہ تجھے جُوا کھیلنے کی دعوت دیں تو تُو ان کے ساتھ گنجفہ کھیلنے نہ بیٹھ جانا۔ ... بلکہ تو انہیں چوسر کھیلنے پر آمادہ کرنا ... اور وہ جب چوسر کھیلنے پر رضامند ہو جائیں تو تو ہر بازی جیتنے کی کوشش کرنا ... ہزار جتن کے باوجود تو ایک بھی بازی جیت نہ

پائے گا اُن سے ... تیرے ساتھ بستی کا سارا سرمایہ دیا جاتا ہے، اس امید پر کہ تو اسے صحیح مصرف میں لائے گا ... اور وہ مصرف ہے ان کے پانسے کو وہاں سے برآمد کرنا ـــــ تو صاحبو! یہ کہہ کر بستی کا حاکم چند لمحوں کے لئے رُکا اور پھر طاقچے سے زرد پتّوں میں لپٹی ایک کتاب اُٹھا کر اس منتخبہ آدمی کے حوالے کی اور اسے درمیان سے کھولنے کا حکم دیا ـــــ کتاب کے صفحوں میں ایک جوف تھا اور اس جوف میں ایک پانسا دبا تھا! بستی کے حاکم نے کہا کہ دیکھ یہ پانسا جو اِس کتاب کے جوف میں دبا ہے ان کے پانسے سے بدل لینا۔ اور یہ بھی سُن کر جو علامتیں ان کے پانسے پر بنی ہیں وہ ایک طِلسم کا نقش ہیں ... تو اُن کے پانسے کو اس کتاب کے جوف میں دفن کر کے اپنی پہلی فرصت میں جلا دینا ... پانسے کے جلتے ہی وہ طِلسم ٹوٹ جائے گا اور طلسم کے ٹوٹتے ہی ہم اُن کے عذابوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے ... لیکن یاد رکھ! کام پُل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے ... وہاں ہر خطا کار کو صلیب دینے کا دستور ہے ... کامیابی تیری قسمت پر منحصر ہے ... ہم تیری سلامتی کی دعا کرتے رہیں گے۔"

اس نے پل بھر کے لئے سوچا۔ اس کام کا نہ تو مجھے کوئی معاوضہ دیا جائے گا نہ انعام ... نہ تو میرے کام کی پذیرائی ہوگی۔ نہ مجھے کوئی صلہ ملے گا ... جو زندگی جی رہا ہوں وہ کوری اور سپاٹ ہے، بے کیف ہے، بے معنی ہے۔ اور جیتے جیتے تنگ آ چکا ہوں میں۔ یہ کوری، سپاٹ، بے کیف اور بے معنی زندگی ... میرا عدم وجود برابر ہے۔

یہ سوچتا ہوا وہ مہم پر روانہ ہوا ـــــ

دفعتاً ایک پُر اسراری گونج سنائی دی۔ چوپال میں بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے

قصّہ سنتے ہوئے لوگ چونک پڑے۔ قصّہ گو کے لب سِل گئے۔ وہ گونج رفتہ رفتہ ایک شور میں بدل گئی۔ پھر اس شور میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک پیدا ہو گئی۔ چوپال میں بیٹھے، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگوں کے چہرے یکایک یرقان زدہ سے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کے ڈھیلے اپنے خانوں سے اُبل پڑے۔ قصّہ گو نے لرزتی ہوئی قندیلوں کو بجھا دیا۔ چوپال اندھیرے کی قبر میں ڈوب گئی۔ آنِ واحد میں چالیس گھُڑسوار چوپال کے قریب سے دندناتے ہوئے گزر گئے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سنّاٹے کو چیرتی ہوئی آواز آئی۔

"کھُل جا سِم سِم"۔ کھُل جا سِم سِم... کھُل جا سِم سِم..."

کسی چٹّان کے سرکنے کی زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ کچھ دیر تک گھوڑوں کے ٹاپوں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

برگد پر ٹنگی ہوئی قندیلوں کو قصّہ گو نے پھر روشن کر دیا۔ چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی کیفیت اپنے معمول پر لوٹ آئی۔

نو وارد نے پوچھا: "کون تھے وہ لوگ؟"

سب خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نو وارد نے پھر پوچھا: "کیا یہ گھڑسوار ہر رات یہاں سے گزرتے ہیں؟ کیا ان کا مسکن اسی غار میں ہے؟"

چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگ اب بھی خاموش رہے۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

قصہ گو نے کہا: کوئی نہیں جانتا انھیں... کوئی نہیں جانتا... ان کے اسرار جاننے کی کوشش میں اس بستی نے اپنے بیسیوں سپوت کھوئے ہیں۔ جو بھی اس مہم پر گیا لوٹ کر

نہیں آیا۔"

یہ سنتے ہی نووارد کو اچانک سردی کا شدید احساس ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر دبک کر

بیٹھ گیا۔

وہ بوڑھا اب ایک میدان میں حیرت زدہ سا کھڑا ہے۔ فاختہ اب اس کے داہنے شانے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور بوڑھے نے کتاب سینے سے لگا رکھی ہے۔ گدھا سعادت مندی سے اُس کے پیچھے سر جھکائے ہوئے کھڑا ہے۔ پیٹھ پر اُس کے وہ صندوق لدا ہوا ہے اور وہ صندوق مقفل ہے۔ میدان کے ایک سرے پر بے شمار صلیبیں ایستادہ ہیں۔ اُن پر ٹنگے جسموں سے خون رس رہا ہے۔ سیاہ پروں اور نکیلی چونچوں والے پرندے اُڑتے اُڑتے آتے ہیں اور جھپٹ کر اُن مصلوب زدہ جسموں کا گوشت نوچ کر چلے جاتے ہیں۔ میدان کے دوسرے سرے پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے لوگ گنجفہ کھیل رہے ہیں۔

بوڑھا بآوازِ بلند کہتا ہے:

"بھائیو! تمہاری بستی میں نووارد ہوں۔ لمبا سفر طے کرتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ تھکا ماندہ ہوں۔ زادِ راہ سے محروم ہوں۔ آج سبات کا دن ہے، یعنی روزے اور آرام کا دن۔ اللہ والا ہوں اس لئے تم سے سرائے کا پتہ پوچھتا ہوں، بتاؤ تو جا کر پڑ رہوں۔ اور تم سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ آج سبات کا دن ہے، یعنی روزے اور آرام کا دن۔ اس لئے عبادت کرو اُس پروردگار کی کہ جس نے زمین آسمان بنائے اور دن رات کو چاند سورج کی قندیلوں سے روشن کیا۔"

انہوں نے اس کی بات پر قہقہے لگائے اور بجائے اس کی ہدایت پر غور

کرنے لگے۔ اس کے مال و متاع کا سودا کرنے لگے۔

بوڑھے نے کہا: عزیزو! میرے مال و متاع کا سودا نہ کرو۔

"یہ فاختہ اور یہ کتاب دونوں تمہارے ہیں اور اس گدھے کی پیٹھ پر لدا ہوا یہ صندوق بھی تمہارا ہے۔ میں تو اِن کا امانت دار ہوں۔

انہوں نے دریافت کیا:

"اس صندوق میں کیا ہے؟"

بوڑھا بولا: "تمہارا اثاثہ۔"

اُن میں سے ایک کہ جو بُچا تھا کہ اُس کا داہنا کان ندارد تھا بولا:

"ہمارے نوشتوں میں لکھا ہے کہ پرُدس کی بستی سے کوئی آئے گا اور ہمارا پانسا ہم سے پھر لے جائے گا۔ ____ اس قلندرانہ بھیس میں کہیں تم ہی تو وہ سارق نہیں؟"

بوڑھا گلوگیر آواز میں بولا: "صاحبو چاہو جو کہہ لو، میں بُرا نہیں مانتا ____ حقیقت تو یہ ہے کہ میں وہ شخص نہیں کہ جس کی آمد کی تم خبر رکھتے ہو۔ مگر دکھ اس بات کا ہے کہ تم اس کی پہچان نہیں رکھتے۔ ایک اعتبار سے تمہارا شُبہ درست ہے۔ اس ٹھگ بازاری کے دور میں سب کچھ ممکن ہے ____ مجھ پر اعتبار کرو کہ میں وہ نہیں ہوں کہ جس کی آمد سے تم خوف زدہ ہو ____ مجھے سرائے کا پتہ بتاؤ تاکہ وہاں پہنچ کر میں اپنی شب بسری کا سامان کروں۔"

وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے اور بحث و مباحثہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ بوڑھا وہ سارق نہیں ہے جس کا نوشتوں میں ذکر آیا ہے۔ انہوں نے بوڑھے کو اپنے پاس بلایا اور اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔

پھر انہوں نے اُسے مچھلی اور روٹی پیش کی اور پیالہ شراب کا لبریز کر کے اس کے آگے رکھ دیا۔

بوڑھا روٹی کھاتا جاتا تھا اور شراب کے گھونٹ لیتا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک جو کہ بُچّا تھا جس کا داہنا کان ندارد تھا بولا:

"اے بوڑھے! تو نے ابھی ابھی بتایا تھا کہ تو روزے سے ہے اور دن سبات کا ہے، اسے عبادت میں گزارنا چاہیئے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تو نہ صرف روٹی کھا رہا ہے بلکہ شراب بھی پیئے جا رہا ہے اور اس گنجفے کے کھیل میں تیری دلچسپی بھی شامل ہے۔ سچ سچ بتا کہ تو کون ہے؟"

بوڑھا بولا: "یہ سچ ہے کہ مَیں روزے سے تھا اور دن عبادت میں گزار دینا چاہتا تھا۔ اگر تم مجھے اپنے میں شامل نہ کرتے اور مجھے سرائے پہنچا دیتے تو میں ہرگز اپنا روزہ نہ توڑتا ـــــ لیکن تم نے مجھے اپنے میں شامل کر لیا اس لئے میں نے پروردگار سے معافی طلب کی اور اپنا تقویٰ تمہاری خوشنودی کی نذر کر دیا۔ تم جانتے ہو کہ روشنی گدلے پانی سے نہیں چھنتی، وہ بذات خود گدلی ہو جاتی ہے۔ میں نے روشنی کو گدلا ہونے سے بچا لیا۔"

وہ اس کے دلائل سے قائل ہو گئے اور ناگواری سے اُس بُچّے کو دیکھنے لگے، اِس پر بُچّے نے اپنی ہتک محسوس کی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔

کچھ دیر بعد بوڑھا اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹہلتا ہوا اُن صلیبوں کے قریب جا پہنچا۔ بُچّا، کہ جو سائے کی طرح بوڑھے کے ساتھ ساتھ تھا بولا:

"اے بوڑھے تو کس ملک کا باشندہ ہے؟ اور کس ملک کو جاتا ہے؟"

بوڑھا بولا:

"نہ تو میرا کوئی آغاز ہے نہ انجام! میں نے زندگی بھر مسافری کی ہے۔ شہر شہر، قریہ قریہ گھوما ہوں۔ جگہ جگہ رُک کر اس کتاب میں درج حمد سناتا ہوں۔ لوگ سُن کر خوش ہوتے ہیں تو میرے آگے کچھ رکھ دیتے ہیں، اور ناراض ہوتے ہیں تو آوارہ کتّوں کو میرے پیچھے لگا دیتے ہیں۔ تب میں اُن کے حق میں دعائیں کرتا وہاں سے چل دیتا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ ان صلیبوں پر مصلوب کیے گئے لوگ کون؟ اور یہ لوگ یہاں کیونکر پہنچے ہیں؟"

بچّے نے ایک سمت انگلی اٹھا کر میدان کی طرف اشارہ کیا... اور بولا "وہ رہا تیرے سوال کا جواب۔"

بوڑھے نے دیکھا کہ دور کوئی شخص اپنی پیٹھ پر ایک وزنی صلیب اٹھائے گرتا پڑتا چلا آتا ہے اور بے شمار کتّے اس کے تعاقب میں ہیں۔ بوڑھا تیزی سے اُس شخص کی طرف بڑھا۔ بچّے نے چیخ کر کہا:

"رُک جا بڈھے، کیا کرتا ہے۔ وہ کتّے تیری تکّا بوٹی کر دیں گے۔ خاطر جمع رکھ، وہ کتّے وہاں سے لوٹ جائیں گے۔ اُن کا کام خطا کار کو وہاں تک پہنچانا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمارے دائرۂ اختیار میں آجاتا ہے۔"

یہ سُن کر بوڑھا اپنی جگہ پر پتھر ہو گیا۔ لیکن اب وہ بڑی دردمندی سے اُس سمت دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ کتّے واقعی اس صلیب بردار شخص کو چھوڑ کر واپس ہو رہے تھے۔

آن واحد میں آسمان پر کالے پروں اور نکیلی چونچوں والے پرندے منڈلانے لگے۔ اُن کی کریہہ الصّوت چیخوں سے فضا مکدّر ہو گئی۔ صلیب کے بوجھ سے نڈھال وہ شخص

لڑکھڑاتا ہوا ان کے قریب آیا۔ بُچّے نے جھپٹ کر اس کے عَبا کی جیب میں سے ایک پرزہ نکالا۔ اور باآوازِ بلند پڑھنے لگا:

"سردار کاہنوں، فریسیوں اور صدرِ عدالت کے متفقہ فیصلے کے مطابق اسے صلیب دی جاتی ہے۔ اس کا جُرم ہے کہ اس نے ہمارے مقدس پانسے کو چرانے کا قصد کیا تھا۔"

بوڑھے نے صلیب بردار شخص کو سہارا دیا کہ وہ کھڑا ہو سکے۔ ایک نظر میں یوں لگتا تھا کہ گویا اس کے جسم پر کئی لوگوں نے اپنے ہتھیاروں کو رگڑ رگڑ کر آب دی ہو۔ وہ جو میدان کے دوسرے سرے پر بیٹھے گنجفہ کھیل رہے تھے صلیب بردار شخص کو دیکھ چکے تھے، بازی کے خاتمے پر بدن اینٹھتے، سستی اتارتے اُٹھے۔ پھر اُنہوں نے پاس ہی پڑا ہوا ایک وزنی تھیلا اٹھایا اور اس طرف کو چل پڑے۔

لذّت اور مسرّت سے سرشار جب وہ سادیّت پرست بُچّا کہ جس کا داہنا کان ندارد تھا اپنے ساتھیوں کو پرزے پر درج وہ مژدہ سنانے کو جوں ہی دوڑا صلیب بردار شخص نے موقع غنیمت جان کر بوڑھے سے عاجزانہ درخواست کی:

"اے پیرِ باراں دیدہ! وہ جو مشرق کی سمت ٹیلہ نظر آتا ہے، اس کے پرلی طرف ایک بستی ہے۔ میں ساکن اس بستی کا ہوں۔ میری التجا ہے کہ وہاں جا کر میرا سارا ماجرہ کہہ سنا اور دیکھ کہ میرے سینے سے بندھی ایک کتاب ہے تو اسے کھول کر اپنے پاس محفوظ کر لے اِس میں وہ پانسہ دبا ہے جس سے اِن ستمگاروں کا پانسہ بدلنے اور پھر اسے اسی کتاب میں دفن کر کے پھونک دینے کا فریضہ بستی کے حاکم نے مجھ کو سونپا تھا۔ تو یہ کتاب اُن کو بہ حفاظت پہنچا دینا۔"

بوڑھے نے پھرتی سے وہ کتاب اپنی تحویل میں لے لی اور ایک نظر میں اس کا جائزہ

بھی لے لیا۔ کتاب کے جوف میں وہ پانسہ اب بھی موجود تھا۔

بوڑھے نے اپنے دل میں اُس نوجوان کے تعلق سے عجیب سا لگاؤ محسوس کیا۔

جاں نثاری کے شدید جذبے میں پوشیدہ دلکشی عین رخصتی کے وقت بے نقاب ہوئی تھی۔

ادر جبر کی بارود سے مسمار کیے گئے وجود سے اٹھتا ہوا دھواں بھی بوڑھے نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔

بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر قسم کھائی کہ وہ بذاتِ خود یہ فریضہ انجام دینے کی کوشش کرے گا ورنہ اس کی سونپی ہوئی امانت بستی کو پہنچا دے گا۔

نوجوان دردمندی سے مسکرایا اور بولا:

"اب مجھ پر موت کی اذیّت گراں نہ گزرے گی۔ میں اُسے آسانی سے برداشت کروں گا۔" یہ کہہ کر نوجوان خاموش ہو گیا۔

اس کے الفاظ بوڑھے کے کانوں میں بڑی دیر تک گونجتے رہے۔

وہ بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ انہوں نے بوڑھے کو پرے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا کچھ فاصلے پر پیڑ کے سائے میں بیٹھے ہوئے اپنے گدھے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا کہ جس کی پیٹھ پر وہ صندوق لدا ہوا تھا۔ اور وہ صندوق مقفّل تھا۔ فاختہ بے چینی کی حالت میں بوڑھے کے ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر آ جا رہی تھی۔

انہوں نے اس کی پیٹھ سے بندھی صلیب کھول دی اور صلیب کو فرش پر لٹا دیا۔ پھر انہوں نے اس کے عبا کو اس کے جسم سے جدا کیا۔ پھر اُسے صلیب پر یوں لیٹنے کا حکم دیا

کہ اُس کے شانوں تک کا جسم صلیب کے عمودی حصے پر رہے اور دونوں باز کھل کر
صلیب کے اُفقی حصے پر پھیل جائیں ۔ وہ صلیب پر لیٹ گیا اور اس نے اپنے جسم کو
ان کی ہدایت کے مطابق صلیب پر قائم کر دیا ——

انہوں نے اس وزنی تھیلے میں سے تسمے نکالے اور اس کے صلیب پر
دائیں بائیں پھیلے ہوئے بازوؤں کو اُن تسموں سے صلیب کے ساتھ کس دیا ۔ اس کے
بعد انہوں نے اس کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر یوں رکھا کہ اس کی دونوں پنڈلیاں
آپس میں جڑ گئیں ۔ انہوں نے اس کی پنڈلیوں کو بھی ان تسموں کی مدد سے صلیب
کے ساتھ جکڑ دیا ۔

جب وہ ایک دوسرے سے مشورہ کرکے مطمئن ہو گئے کہ وہ صلیب سے
خوب اچھی طرح جکڑا جا چکا ہے ۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھ پیر کو جنبش دینے سے بھی مجبور
ہے تو انہوں نے اُس بچّے کو کہ جس کا داہنا کان ندارد تھا اور جو دور کھڑا پیشاب کر رہا
تھا یوں اشارہ کیا کہ گویا جانور باندھ کر گرایا جا چکا ہے اور ذبیحہ کے لئے تیار ہے ۔ ان کا
اشارہ پاتے ہی بچّا اچھلتا کودتا ، قلقاریاں مارتا ہوا وہاں جا پہنچا ۔

وہاں پہونچتے ہی بچّے نے اس وزنی تھیلے میں سے بالشت بھر لمبے اور دو دو
انگل موٹے تین عدد کیلے نکالے ، پھر ایک وزنی ہتھوڑا نکالا ۔ یہ منظر بوڑھے کے کندھے
پر پہلو بدلتی فاختہ دیکھ رہی تھی ۔ وہ گدھا بھی دیکھ رہا تھا کہ جس کی پیٹھ پر وہ صندوق
لدا تھا اور وہ صندوق مقفّل تھا ۔ یہ منظر بچّے کے رفقا بھی دیکھ رہے تھے ۔ لیکن یہ منظر وہ
بوڑھا نہیں دیکھ رہا تھا ۔ اُس نے اپنی آنکھیں میچ رکھی تھیں ۔ لیکن وہ اپنے دیگر حواس
اربعہ کو پابند نہ کر سکا تھا ۔ وہ تمام حواس اس منظر کو آنچ دیتے ہوئے بوڑھے کے ذہن

میں منتقل کر رہے تھے۔

ٹُچے نے بجلی کی سرعت سے اُن بالشت بھر لمبے اور دو دو انگل موٹے کیلوں کو یکے بعد دیگرے نوجوان کی کلائیوں اور نچلے پنجوں میں، اس وزنی ہتھوڑے سے ٹھونک ٹھونک کر پیوست کر دیا۔ نوجوان کی ضبط کی ہوئی سسکیوں سے وہ وزنی صلیب لرزنے لگی۔ بوڑھے کے کندھے پر پہلو بدلتی فاختہ تڑپ کر گری اور جاں بحق ہو گئی۔ بوڑھے نے فاختہ کو کانپتی ہتھیلیوں میں اٹھایا، پھونک پھونک کے اس کے خاکستری پَروں سے گرد اڑائی، اُسے آنکھوں سے لگایا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

قصہ گو نے آسمان پر نظر ڈالی اور چوپال میں بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے اور محویت سے قصہ سنتے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "تو صاحبو! آسمان پر تارے ایک ایک کر کے رخصت ہوتے ہیں اور مشرق میں صبح کاذب کا اُجالا دکھائی پڑتا ہے۔ اس لئے قصے کو سمیٹتا ہوں تا کہ کل کوئی نووارد آ کر یہ نہ پوچھے کہ فاختہ کی موت کا سبب کیا تھا۔

تو صاحبو! اُن سبھوں نے مل کر اُس صلیب کو تین کھونٹوں سے باندھ کر ایستادہ کیا اور اپنا سامان بٹور کر رخصت ہونے لگے تو انہیں دور سے دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے بوڑھے کی آواز سنائی دی۔ قریب پہنچ کر انہوں نے بوڑھے سے دریافت کیا۔

"کیا تو اس مصلوب کے لئے روتا ہے کہ جس نے ہمارے مقدس بانسے کو چُرانے کی کوشش کی تھی اور ناکام ہوا۔ یا ہماری سزا کی اذیت ناکی پر تیرا جگر پارہ پارہ ہے؟"

بوڑھا اپنی ہچکیوں پر قابو پاتا ہوا بولا:

"اُس نوجوان کی موت کا مجھے اتنا رنج نہیں کہ جتنا ملال مجھے اِس فاختہ کی

موت کا ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی ہتھیلیوں میں پڑی فاختہ اُن کے قدموں میں رکھ دی۔ اور بولا:

"مجھے فاختہ کی موت کا اس قدر ملال نہیں کہ جس قدر غم مجھے اپنے مقدس کلام کے کھو جانے کا ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنے عبا کی جیب میں سے وہ کتاب نکالی کہ جس کے ہر صفحے پر حمد درج تھی ـــــ لیکن اب کتاب کا ہر صفحہ کورا تھا۔ بوڑھے نے وہ کتاب بھی اُن کے قدموں میں رکھ دی اور بولا:

"مجھے اس مقدس کلام کو کھونے کا اتنا غم نہیں کہ جتنا صدمہ مجھے اس گدھے کی بے حسی کا ہے۔"

بوڑھے نے اُس پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ صندوق اب بھی گدھے کی پیٹھ پہ لدا ہوا تھا۔ اور وہ صندوق اب بھی مقفل تھا۔ اور وہ گدھا پیڑ کے ٹھنڈے سائے میں بیٹھا ہوا جگالی کر رہا تھا۔

● ـــــــ آپ کی کہانیوں میں ایک نئی دنیا کے دروازے کھلتے ہیں، دبے کچلے، مظلوم اور مجبور انسانوں کی دنیا ـــ ایک ایسی دنیا جسے آپ نے کسی بلندی سے نہیں بلکہ اس میں رچ بس کر دیکھا ہے ـــ پھر آپ کی کہانیوں میں جو لطیف رمزیت اور اشاریت ہے، وہ کہانی کے باہر کے حقائق بھی دکھاتی ہے۔

ـــــــ رشید حسن خاں (خط سے اقتباس)

● ـــــــ منٹو کے بعد ہمارے ہاں کم لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی چیز جو درخورِ اعتنا رہی، یعنی کہانی میں کہانی پن کا عنصر وہ آپ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ آپ کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا گویا بند کمرے میں اچانک کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آ گیا ہو۔

ـــــــ محمود ایاز (خط سے اقتباس)

● ـــــــ انور قمر نے چند ہی افسانے لکھ کر فکر کی جس گہرائی اور احساس کی شدت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ انور قمر نے اپنے اردگرد کے ماحول کی تیز و تند لہروں کی چوٹ کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اُس کی معنویت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے انہوں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں انہیں وہ فرد اور سماج کے بنیادی مسائل سے جوڑ دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ان پیچیدہ اور گوناگوں تجربات میں ایک مرکزی خیال ہے جو اُن کے قریب قریب تمام افسانوں میں جاری و ساری ہے۔ اور وہ ہے جبر اور اُس سے پروردہ دہشت جس کے باعث فرد کی تمام تر شخصیت مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔

ـــــــ دیویندر اسّر

● ـــــــ کسی بھی بے حس معاشرے میں جہاں آدمی اپنا روحانی اثاثہ کھو دے اور جہاں سیاست زندگی پر مسلط ہو جائے وہاں شعر کہنا یا افسانہ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، لیکن اس کوہ کنی کا فن آتا ہی کتنوں کو ہے؟

پاکستانی افسانہ نگار سے ہندوستانی افسانہ نگار کا مسئلہ نہ صرف زیادہ مشکل بلکہ اہم بھی ہے۔ پاکستانی افسانہ نگار نے اپنی تاریخی بساط چودہ سو برس پر پھیلائی اور ۱۹۴۷ء کے المیہ میں سے اپنے خون کی بوندیں بانٹ لیں۔ لیکن ہندوستانی افسانہ نگار کا خون اس زمین میں جذب ہو چکا ہے اور وہ اُن پھولوں کے کھلنے کا آج تک انتظار کر رہا ہے جن میں اُس کے خون کا رنگ جھلکے اور جس کی سُگندھ میں اُس کے ہزاروں سالہ ماضی کی بو باس ہو۔ کیا یہ المیہ نہیں ہے ـــــــ انور قمر کا افسانہ کسی المیہ کی داستان نہیں کہتا، بلکہ پورے المیہ میں اپنے آپ کو سمو دینے کی جدوجہد کرتا ہے یہ افسانے کی تیسری ارتقائی سمت ہے۔ کہ شعور کی بیداری کے ساتھ ہی افسانہ اپنے اردگرد کے اچھے، بُرے واقعات کا بیانیہ بن کر رہ جاتا ہے اُس کے بعد وہ سیاسی اور معاشرتی بصیرت کے گہنے پہنتا ہے اور پھر ـــ افسانہ اپنے خالق کو واقعاتی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی دھندلکوں میں اپنے گمشدہ وجود کی نشان دہی پر اکساتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں افسانہ نگاری کوہ کنی کی منزل میں داخل ہوتی ہے۔ اور یہی وہ محل ہے جہاں افسانہ نگاری جوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرتی ہے۔

انور قمر نے تیشہ ہاتھ میں تھام لیا ہے۔ اور پہاڑ کی اس جانب سے صدائے تیشہ چلی آ رہی ہے۔

ـــــــ سریندر پرکاش

● ـــــــ انور قمر ۱۹۷۰ء کے بعد کے اُبھرنے والے افسانہ نگاروں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے کہانی میں کہانی پن کی تجدید کو اپنا بنیادی مقصد سمجھا۔ 'چاندنی کے سپرد' اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

'چاندنی کے سپرد' کے افسانوں میں افسانہ نگار اپنے تخلیقی لہجے کو پانے کی جاں سوز کشمکش سے گزرتا دکھائی دیتا ہے مگر 'چوپال میں سُنا ہوا قصہ' کے افسانے اس کی خلاقانہ انفرادیت کا واضح نقش بن گئے ہیں۔

ـــــــ سلام بن رزاق